

طباعت : زیر نگرانی جناب جلال الدین اکبر

”اردو کمپیوٹر سنٹر فون نمبر 4530850 سیلولر 9848022987

17-1-181/M/35 - روبرو جامعہ عائشہ نسوان

داراب جنگ کالونی - مادنپسٹ - حیدرآباد ۵۹ (اے-پی)

1/G/02/W - 175 dt.

22-11-02

نہ سہم شب سیاہ سے ، ذرا دیکھ تو اُفق پر
ہے جہان نور پنہاں انہیں ظلمتوں کے آگے

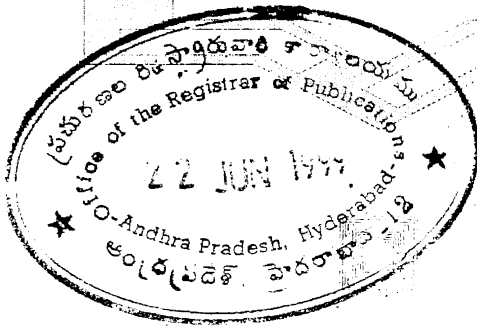
عزیز حسین عزیز

U. D. L.

Acc. No.
743

251/ROP
47

صدائے کرب



102-9

2-95

عزیز حسین عزیز

فالکن ہاؤز، 16-1-24/E/3A/3B

فرح کالونی، سعید آباد، حیدر آباد-500059

(اے۔ پی۔)۔ انڈیا

فون (رہائش): 4531097

جملہ حقوق بحق محمد و جہت حسین عادل (فرزند اکبر) محفوظ

Acc No. اول
743

سنہ اشاعت : دسمبر ۱۹۹۸ء

کتابت : الفلاح کمپیوٹرس، مادنا پیٹ، سعید آباد حیدر آباد۔ فون: 4413793

طباعت : او۔ ایس۔ گرافکس، نارائن گوڑہ، حیدر آباد

تعداد : ۵۰۰

سرورق : خطاط العصر عالیجناب محمد عبدالسلام صاحب

ترتیب و تشکیل : مصنف

قیمت : حیدر آباد -/100 (اضافہ پوسٹل چارجس دیگر شہروں کیلئے)
Rs.

(سعودی عرب :-/50 SR)

ناشر : مکتبہ شعر و حکمت، 6-3-659/2، کپاڈیہ لین، سوماجی گوڑہ، حیدر آباد۔

کتاب ملنے کے پتے

۱۔ مکتبہ شعر و حکمت، 6-3-659/2، کپاڈیہ لین، سوماجی گوڑہ، حیدر آباد۔

۲۔ حسامی بک ڈپو، چارمینار، حیدر آباد۔

۳۔ سیلز کاؤنٹر روزنامہ سیاست، جواہر لال نہرو روڈ، حیدر آباد۔

۴۔ الکتاب پبلشرز، گن فاؤنڈری، حیدر آباد۔

۵۔ حیدر آباد لٹریچر فورم (حلف) 6-3-659/2، کپاڈیہ لین، سوماجی گوڑہ، حیدر آباد۔

۶۔ اسٹوڈنٹس بک ہاؤس، چارمینار، حیدر آباد۔

۷۔ اقبال اکیڈمی، مدینہ منشن، نارائن گوڑہ، حیدر آباد۔

۸۔ سب رس کتاب گھر، سوماجی گوڑہ، حیدر آباد۔

۹۔ ادارہ شگوفہ، 31 پیپلز کوارٹرس، معظم جاہی مارکیٹ، حیدر آباد۔

۱۰۔ انجمن ترقی اردو، اردو ہال، حمایت نگر، حیدر آباد۔

۱۱۔ برمکان مصنف۔ فالکن ہاؤس فرح کالونی، سعید آباد حیدر آباد۔ فون رہائش 4531097۔

۱۲۔ مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، دہلی۔

۱۳۔ شب خون کتاب گھر، 313 رانی منڈی، الہ آباد 3۔

یہ مجموعہ کلام اردو اکیڈمی آندھرا پردیش حیدر آباد کی جزوی اعانت سے شائع کیا گیا۔

ترتیب

۶۴۳

صفحہ نمبر	اشارہ	صنف	جلد نمبر	سکینز
۱	ٹائٹل			۱
۲	اشاعتی تفصیل			۲
۱۰	انتساب			۳
۱۱	تعارف			۴
۱۳-۱۲	آپ بیتی			۵
۱۸-۱۵	ادب میں جمود اور تعطل کا احساس (ذاتی رائے)			۶
۱۹	عطا کرتا ہے جب تو ہی تو اپنے دل سے کیا مانگوں	حمد	۱	۷
۲۰	روشنی آپ ہیں دیا ہوں میں		۲	۸
۲۱	نعت شریف اس کائنات میں ہیں جلوہ نما محمد		۱	۹
۲۲	دیدہ بینا اگر ہو دل بیدار کا		۲	۱۰
۲۳	ہو مری زندگی مدینے میں		۳	۱۱
۲۴	نذرانہ عقیدت خلفائے راشدین		۱	۱۲
۲۵	بارگاہ امام حسینؑ		۲	۱۳
۲۶	رودادِ آدم آدمی مشت خاک کا خاکہ		۱	۱۴
۲۷	تقید پر تقید اے نقیب فکر و دانش ہوش کا پیکر تو بن		۱	۱۵
۲۸	غزلیں غزلیں			۱۶
۲۹	شاعری کی دھن ہے طاری بھرو ہی دیوانگی		۱	۱۷
۳۰	کب تک یہ کہو اپنی نگاہوں سے گروں میں		۲	۱۸
۳۱	میری روداد مرے عیب و ہنر تک پڑھئے		۳	۱۹
۳۲	تو تو پتھر کا صنم ہے جانتا ہوں کیا کروں		۴	۲۰
۳۳	میں ہوں وہ مسافر وقت کہ جسے گھر نہ در کی تلاش ہے		۵	۲۱
۳۴	زیست ہے ہر زحمت حد سے گزر جانے کا نام		۶	۲۲
۳۴	تو ہے مضطرب اے زاہد پس اضطراب کیا ہے		۷	۲۳

۳۵	گردش، اس بات پر اس زمانے میں ہیں ہم	۸	۲۲
۳۵	شعور و حوصلہ گر آجی ہاں گیا ہوتا	۹	۲۵
۳۶	سج مہندہ بیمار ہیں لا	۱۰	۲۶
۳۷	سب کو ملتی ہے کب خوشی یوں بھی	۱۱	۲۷
۳۷	خوابوں کا پیر بن ہے خیالوں کا پیر بن	۱۲	۲۸
۳۸	جو زندگی کے سفر میں آئیں وہ دشت و صحرا اٹھ گال رکھنا	۱۳	۲۹
۳۹	کھرت نکلے تھے اندھی خوشی کیلئے	۱۴	۳۰
۴۰	کیوں سفر میں ہی رہا کرتے ہیں اکثر قافلے	۱۵	۳۱
۴۰	پھر سفر پر جا رہے ہیں ہم سفر کو چھوڑ کر	۱۶	۳۲
۴۱	سن کے جس کو دل بچل جائے وہ نغمہ بھیج دو	۱۷	۳۳
۴۱	کبھی خیرات کو لوٹا نہ دینا	۱۸	۳۴
۴۲	یارب جہاں میں کیسا ظوفاں اٹھا ہوا ہے	۱۹	۳۵
۴۲	نم زندگی سے کہیں ہم کیوں نہ جی لگائیں	۲۰	۳۶
۴۳	یاد بھی جب آ جاتی ہے بھولے ہوئے افسانوں کی	۲۱	۳۷
۴۴	مری چاہتوں کی دنیا تری نفرتوں کے آگے	۲۲	۳۸
۴۵	اجالے جس جگہ ملزم اندھیرے مدتی ٹھہرے	۲۳	۳۹
۴۶	سہا سہا ساجہاں رنگ و بو ہے اور ہوا	۲۴	۴۰
۴۷	ہم کو غم کی بھیک دے کر وہ خوشی کے نام سے	۲۵	۴۱
۴۷	دائرہ اطراف میرے یوں نہ کھینچو پیار سے	۲۶	۴۲
۴۸	ساری رو داد و فاساری حکایت پوچھو	۲۷	۴۳
۴۹	جب سے ہوئی ہے زحمت تکرار گفتگو	۲۸	۴۴
۴۹	چاندنی سے چوٹیں گے دھوپ میں نہائیں گے	۲۹	۴۵
۵۰	رشتہ ناطے کیا ہیں اک آزار ہے یہ	۳۰	۴۶
۵۱	چیتے درخشاں می دیوار کی	۳۱	۴۷
۵۲	اہل دل، اہل نظر، اہل عفا بیٹھے ہیں	۳۲	۴۸
۵۲	یہ حقیقت ہی نہیں ہے ایک افسانہ بھی ہے	۳۳	۴۹
۵۳	کانٹے نہ بچا رہنا، خنجر نہ چھپا رکھنا	۳۴	۵۰
۵۳	چپوٹی کی اس ربتی ہے آتش، وہ مکان رکھ	۳۵	۵۱

۵۴	دیکھا ہر سجدہ پاؤں میں سب کے سب پر بات کرتے ہیں	۳۶	۵۲
۵۵	دل کو بے ملا کچھ تو سکوں جب سے لگی چپ	۳۷	۵۳
۵۶	یوں اپنی راستی پر اترا ہوا ہے شیشہ	۳۸	۵۴
۵۷	چہرہ غوں کے سلنے سے اندھیرا کم نہیں ہوتا	۳۹	۵۵
۵۸	خاک پر روانہ کی طرح بانگن کے ساتھ ہوں	۴۰	۵۶
۵۹	نہ کچھ خوشی کی خوشی ہوئی ہے نہ کوئی غم کا اثر ہوا ہے	۴۱	۵۷
۶۰	دن دہائے آرزوئے زندگی کرتے ہوئے	۴۲	۵۸
۶۱	میں تمھارا ہوں یہ تم نے کیا کہا کوئی نہیں!	۴۳	۵۹
۶۲	ہم کو دیوانہ نہ سمجھو ہم ہیں موحی آدمی	۴۴	۶۰
۶۳	یوں نہ جذبات کے دھارے میں مچل کر تیرو	۴۵	۶۱
۶۴	سو نہ چتے ہیں حل مسائل کا تو تھک جاتے ہیں لوگ	۴۶	۶۲
۶۵	فرقت کے پھر یہ شام و سحر دے گیا کوئی	۴۷	۶۳
۶۶	دوسروں کا درد اکثر ایک افسانہ لگا	۴۸	۶۴
۶۷	جانے دل کا چراغ تھا کیسا	۴۹	۶۵
۶۸	خوبصورت سی یہ عالی زندگی	۵۰	۶۶
۶۹	ہے دنیا کا نہ ملنا گر مصیبت	۵۱	۶۷
۷۰	سایہ جو اونچے گھر کا ہمارے صحن میں ہے	۵۲	۶۸
۷۱	در پہ سائل کی طرح آ کے ٹھہر جاتا ہے	۵۳	۶۹
۷۲	ہوئی تو ہو کر رہے گی بے بسی رہ جائیگی	۵۴	۷۰
۷۳	اگر بے اعتنائی سے روانہ ہو گیا ہوتا	۵۵	۷۱
۷۴	ہوتا نہیں اجالا نورِ سحر سے پہلے	۵۶	۷۲
۷۵	جس دن سے کناروں نے پانی میں اُچھالا ہے	۵۷	۷۳
۷۶	یوں اپنے آپ کو خطرات میں ہم خود ہی لایٹھے	۵۸	۷۴
۷۷	پہ چڑھتی دھوپ نے دیکھا کہاں ہے	۵۹	۷۵
۷۸	غم کا سایہ اوج پر آغوشِ تاریک میں	۶۰	۷۶
۷۹	ناز و نیاز دھوپ کے سر پر اٹھائے	۶۱	۷۷
۸۰	چوٹ کھانا، منسکرانا، دل جگر کا کام ہے	۶۲	۷۸
	جب سفر سے لوٹ کر ہم گھر چلے تو کیا نہ تھا	۶۳	۷۹

۸۱	فطرتی غم آج مصنوعی خوشی میں غرق ہے	۶۴	۸۰
۸۲	یہ ساحل کے تماشائی نگہبانوں میں رہتے ہیں	۶۵	۸۱
۸۳	دن نکلتے ہی سنور جاتا ہے	۶۶	۸۲
۸۳	اڑ کے ذرے خاک کے اس انجمن تک آگئے	۶۷	۸۳
۸۴	کوئی ہر گز نہ یہ سمجھے کہ انجانے میں آ بیٹھے	۶۸	۸۴
۸۵	الجھن کو اور بھی کچھ الجھا گئی ہیں آنکھیں	۶۹	۸۵
۸۶	ہے مرا گھر یار میں بے گھر نہیں	۷۰	۸۶
۸۷	بھولنے والے نہ تڑپاتا تو کیا جاتا تھا	۷۱	۸۷
۸۸	کچھ کہا میں نے تو دنیا نے مرا بچپن کہا	۷۲	۸۸
۸۹	آپ کے واسطے مناسب کچھ	۷۳	۸۹
۹۰	زباں ہو مشتعل تو سر دیہ حالات کیا ہونگے	۷۴	۹۰
۹۱	آگیا گرداب میں آخر سفینہ ان دونوں	۷۵	۹۱
۹۲	آج خطرے میں نظر آتے ہیں آثارِ چمن	۷۶	۹۲
۹۳	اپنی تہذیب کی تصویر جلادی تو نے	۷۷	۹۳
۹۴	شکاری اپنی کوتاہی پہ بچھتا تو کیا حاصل	۷۸	۹۴
۹۵	وقت ہی کا کھیل ہے جس نے دیا ہے بل انھیں	۷۹	۹۵
۹۶	وقت کے سیلاب میں بہتا ہو اد ریا رہا	۸۰	۹۶
۹۷	زندگی تجھ سے بڑا دلدل نہیں دیکھا کوئی	۸۱	۹۷
۹۸	رہبر کسی کا ہے نہ ہی رستہ چلے چلو	۸۲	۹۸
۹۹	نہ چیخو اس حال میں بادِ خزاں تھے تو گلشن کے	۸۳	۹۹
۱۰۰	ہم کو حق سے کوئی مطلب ہے نہ مینانے سے	۸۴	۱۰۰
۱۰۱	جس شہر کی خاک تھے چھانے ہوئے	۸۵	۱۰۱
۱۰۲	نہ اپنی سدھ ہے نہ دنیا کا ہے خیال مجھے	۸۶	۱۰۲
۱۰۳	تسلیموں کے شکفتہ گلاب رکھ دینا	۸۷	۱۰۳
۱۰۴	حوصلہ گردشِ ایام سے برتر رکھنا	۸۸	۱۰۴
۱۰۵	نغم دریا کا کسی جھیل پہ لا دلا نہ کریں	۸۹	۱۰۵
۱۰۶	چرندوں کی نگاہوں میں خس و خاشاک ہے دنیا	۹۰	۱۰۶
۱۰۷	وقت یہ کہتا ہے کہ مجنوں کو بھی دانا کہو	۹۱	۱۰۷

۱۰۸	دکھاوے کی یہ شہرت اور جھوٹی شان رہنے دے	۹۲	۱۰۸
۱۰۹	زندگی صرف تری حسرت املاک میں ہے	۹۳	۱۰۹
۱۱۰	یہ کس نے کہدیا کہ منور نہیں ہیں ہم	۹۴	۱۱۰
۱۱۱	خاکساری کرتے کرتے خار گھنگھر و بن گئے	۹۵	۱۱۱
۱۱۲	یہ نشیبی راہ ہے دھیمی ذرار قمار کر	۹۶	۱۱۲
۱۱۳	جو کلیاں زینت گلشن تھیں خاص وعام کی خاطر	۹۷	۱۱۳
۱۱۴	اے میخانہ حکمت کا حاصل اور ہے	۹۸	۱۱۴
۱۱۵	یہ مت پوچھو کہ کوہ طور ہے کیا	۹۹	۱۱۵
۱۱۶	میں بھی فانی تو بھی فانی اور بانی کچھ نہیں	۱۰۰	۱۱۶
۱۱۷	محافظ نہ، سہارا ہے، بجابے	۱۰۱	۱۱۷
۱۱۸	یہ دنیا اک کھلونا ہے، خدا ہے	۱۰۲	۱۱۸
۱۱۹	نظمیں	نظم	۱۱۹
۱۲۰	شاعر نامہ	۱	۱۲۰
۱۲۱	جننا کے کنارے تاج	۲	۱۲۱
۱۲۲	”مبارکباد“ (بہ ضمن انتخابات حلقہ ارباب ذوق جدہ)	۳	۱۲۲
۱۲۳	”نیاسال“	۴	۱۲۳
۱۲۴	”ایک آس“	۵	۱۲۴
۱۲۵	”عکبوت“	۶	۱۲۵
۱۲۶	”بادل دیکھ کے گھرے پھوڑنا“	۷	۱۲۶
۱۲۷	”انتباہ“ - ”جدت“ - ”آلودگی“	۸	۱۲۷
۱۲۸	”کرب تنہائی“	۱۱	۱۲۸
۱۲۹	”کشف تنہائی“	۱۲	۱۲۹
۱۳۰	۱۹۷۸ء میں فیملی کی سعودی عرب آمد پر ایک تاثر	۱۳	۱۳۰
۱۳۱	ایک پیام۔۔۔ اصحاب زر کے نام	۱۴	۱۳۱
۱۳۲	”تضمین“	۱۵	۱۳۲
۱۳۳	”ہمسایہ“	۱۶	۱۳۳
۱۳۴	”خواہشوں کا سفر“	۱۷	۱۳۴
۱۳۵	”منصوبہ“	۱۸	۱۳۵

۱۳۸	”مہابات“	۱۹	۱۳۶
۱۳۹	”اترے گا آسمان بھلا خاک پر کہاں“	۲۰	۱۳۷
۱۴۱-۱۴۰	”یاد ماضی“	۲۱	۱۳۸
۱۴۲	”واپسی“	۲۲	۱۳۹
۱۴۳	”منزل نامعلوم“	۲۳	۱۴۰
۱۴۴	”ٹھکانہ“۔ ”جرات موج“	۲۵-۲۴	۱۴۱
۱۴۵	”برنداؤن کا بنجارہ“	۲۶	۱۴۲
۱۴۷-۱۴۶	”شہابی جمہوریت“	۲۷	۱۴۳
۱۴۸	آصف صالح کی برسی پر نذرانہ تحیہ	۲۸	۱۴۴
۱۵۰-۱۴۹	”ائے وطن ہندوستان“	۲۹	۱۴۵
۱۵۱	”اژدھا“	۳۰	۱۴۶
۱۵۳-۱۵۲	”تو پھر اس عمارت کا حافظ خدا ہے“	۳۱	۱۴۷
۱۵۴	”وہ سحر لوٹ کر آگئی بھی تو کیا“	۳۲	۱۴۸
۱۵۶-۱۵۵	”زبان یا رمن ترکی و من ترکی نمی دانم“	۳۳	۱۴۹
۱۵۷	شہادت بابری مسجد کی پہلی برسی پر۔۔ ایک تاثر	۳۴	۱۵۰
۱۶۱-۱۵۸	”بربریت کا سفر“۔۔ ”پانچب“	۳۵	۱۵۱
۱۶۲	”عصر حاضر“	۳۶	۱۵۲
۱۶۳	”اخبار“	۳۷	۱۵۳
۱۶۴	”ظلم کی آندھیاں“	۳۸	۱۵۴
۱۶۵	”زنجیر دار“	۳۹	۱۵۵
۱۶۶	”سر دار“	۴۰	۱۵۶
۱۶۷	”بحث“۔۔ ”حوصلہ“۔۔ ”دلاسہ“۔۔ ”میحائی“	۴۲-۴۱	۱۵۷
۱۶۸	”مشورہ“	۴۵	۱۵۸
۱۶۹	”محاسبہ“	۴۶	۱۵۹
۱۷۰	”خشت و سنگ“	۴۷	۱۶۰
۱۷۱	”اعتماد“۔۔ ”دوستی“	۴۹-۴۸	۱۶۱
۱۷۲	”معاہدہ“	۵۰	۱۶۲
۱۷۳	”انحراف“	۵۱	۱۶۳

۱۷۴	”اتحاد“	۵۲	۱۶۴
۱۷۵	”ساکھ“	۵۳	۱۶۵
۱۷۶	”تسلط“	۵۴	۱۶۶
۱۷۷	”انتشار ذات“	۵۵	۱۶۷
۱۷۸	”گہر“	۵۶	۱۶۸
۱۷۹	”چراغ زندگی“	۵۷	۱۶۹
۱۸۰	”ذہن“	۵۸	۱۷۰
۱۸۱	”خواب اور تعبیر“	۵۹	۱۷۱
۱۸۲	”تقدیر و تدبیر“	۶۰	۱۷۲
۱۸۳	”وہم و یقین“	۶۱	۱۷۳
۱۸۴	”مقیاس“	۶۲	۱۷۴
۱۸۵	”یہ دنیا“ -- ”لمحہ فکر“	۶۳-۶۴	۱۷۵
۱۸۶	”پگڈنڈی“	۶۵	۱۷۶
۱۸۷	”تشویش و اندیشہ“	۶۶	۱۷۷
۱۸۸	”برکار ہستی“	۶۷	۱۷۸
۱۸۹	”نقش بر آب“	۶۸	۱۷۹
۱۹۰	”شراب ہستی“ -- ”تقید جس“ -- ”رحلت“ -- ”پرسہ“	۶۹-۷۰	۱۸۰
۱۹۱	”مزار“	۷۳	۱۸۱
۱۹۲	”برزخ“	۷۴	۱۸۲
۱۹۳-۱۹۴	”قیامت“	۷۵	۱۸۳
۱۹۵-۱۹۶	”زمین سخت ہے آسمان دور ہے“ -- ایک پیام -- ملت کے نام	۷۶	۱۸۴
۱۹۷-۱۹۸	”فریاد“	۷۷	۱۸۵
۱۹۹	”شکوہ“	۷۸	۱۸۶
۲۰۰-۲۰۸	قطعات	۷۹	۱۸۷
	قطعات		۱۸۸

انتساب

کرب کی شکار قوم کے نام

جہاں میں نفرتوں کی ہر طرف یلغار ہے ساقی
 محبت۔ اب یہاں رُسوا، سرِ بازار ہے ساقی
 یہ دنیا کارِ گاہِ آفت و آزار ہے ساقی
 سکونِ قلب کا ملنا یہاں دُشوار ہے ساقی
 مسرت سے چمک اُٹھتی تھیں آنکھیں دیکھ کر جس کو
 دلوں میں اب کہاں وہ جذبہٴ ایثار ہے ساقی
 یہاں دُشمن تو ہے کچھ دورِ حقّت سے، ندامت سے
 مگر جو دوست ہے وہ برسرِ پیکار ہے ساقی
 یہ بزمِ میکشی اپنی نہ یہ جام و سُبُو اپنے
 تو میخواروں میں پھر کس بات کی تکرار ہے ساقی
 زکاوت جس کی فطرت ہو اُسے رستہ نہیں کہتے
 رہ ہستی ہے یا اک آہنی دیوار ہے ساقی
 بوجہ کیفِ مستی رقص میں ہیں بحر و بر لیکن
 صدائے کرب لگتا ہے پس جھنکار ہے ساقی
 بناوٹ کے اُصواوٰں میں دکھاوے کی صداقت ہے
 قلم کا زور ہے اور کاغذی سرکار ہے ساقی
 ہزاروں مٹ گئے تعمیر کی حسرت لیے دل میں
 حقیقت میں یہ دنیا ریت کی دیوار ہے ساقی
 عزیزِ بے کس و بے حال کا کوئی نہیں ہمد
 جہاں میں ایک تو ہی مونس و غمخوار ہے ساقی

تعارف

شہر میں لگتا نہیں ہے دل بیابانی ہوں میں
بس یہی کافی ہے میرے واسطے ، فانی ہوں میں
میرا قد کیوں دیکھتے ہو میں کوئی پرِ بَت نہیں
میری گہرائی کو دیکھو جھیل کا پانی ہوں میں



جو ہم میں تم میں ہے اُس رشتہ باہم کو پہچانو
تمہارے چاہنے والے ہیں ہم بھی ، ہم کو پہچانو
سبب ہوگا کوئی آخر کسی کی کج نگاہی کا
کبھی تم بھی تو وجہِ نفرتِ پیہم کو پہچانو
مِرے اشکوں کی کیا قیمت ہے اسکا تجزیہ چھوڑو
گلوں کے حال پہ روتی ہوئی شبِ نم کو پہچانو
پرکھنا ہو اگر تم کو ہماری شخصیت پرکھو
عزیزو اس سے پہلے فطرتِ آدم کو پہچانو
ہماری شخصیت سے آپ واقف ہو گئے ، مانا
ہمارے درد کو جانو ہمارے غم کو پہچانو
تسلّی سے کسی کی غمگساری ہو نہیں سکتی
علاجِ غم سے پہلے نُسخہٴ مرہم کو پہچانو
خوشی میں بے رُخی اچھی نہ غم میں بیدی اچھی
اُصولِ انبساط و اقتضائے غم کو پہچانو
بڑی ٹھنڈک ہے مانا گیسوئے جاناں کے سائے میں
یہ سایہ خوب ہے پر اس کے بیچ و خم کو پہچانو

عزیز احساس مر جائے تو پھر انسان مر جائے

اسی احساس سے انسان کے دم خم کو پہچانو

آپ بیتی

میری پیدائش ۱۳/اگست ۱۹۳۴ء کو شہر حیدر آباد کے ایک متوسط گھرانے میں ہوئی۔ اردو میڈیم سے میٹرک کامیاب کرنے کے بعد کاروبار میں والد محترم صوفی احمد حسین صدیقی "قادری الملتانی (موظف الکلریشن، دو خانہ عثمانیہ) کا ہاتھ بٹانے میں سرکاری ملازمت کے حصول کی معیاد عمر گذر گئی۔ والد محترم واجداد سلسلہ قادری الملتانی سے وابستہ تھے۔ دادا پیر حضرت سید غلام علی شاہ صاحب قبلہ عالم متبحر صوفی و فقیر منش تھے۔ (ہم نے اپنی آنکھ اسی پر نور ماحول میں کھولی اور علم حق و تصوف کی سیر حاصل گفتگو اٹھتے بیٹھتے و کھیلے کودتے ہمارے سینوں میں آپ ہی اترتی چلی گئی)۔

۱۹۶۷ء میں شادی ہوئی۔ بعد ازاں ٹائٹل کالج سے بی۔ کام مکمل کیا۔ ٹائپ، شارٹ ہینڈ کی تکمیل کی۔ Aptech سے کمپیوٹر کی P.G.D.C.A. ڈگری برائے (System Analyst) حاصل کی۔ ۱۹۷۶ء اگست میں جدہ، سعودی عرب روانہ ہوا جہاں ایک جاپانی کمپنی KOMATSU LTD. میں بہ حیثیت (Secretary To G.M.(M.E.)) ۱۹۷۶ء اگست ہی سے ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۷۸ء میں فیملی (بیوی و لڑکی) کو سعودی عرب بلوالیا۔ وہاں تین لڑکے اور ایک لڑکی تولد ہوئے۔ انکی تعلیم کا کچھ حصہ وہیں پر گذرا۔ ایک سنہری دور سے مستفید ہونے کے بعد کچھ ناگزیر وجوہات کی بناء ۱۹۸۶ء میں واپس انڈیا آگیا۔ ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۶ء میں دوبار قلیل مدت کیلئے جدہ سعودی عرب ملازمت کیلئے چاچا کا ہوں۔ لیکن بغیر اہل و عیال کے وہاں جی نہ لگا۔ اور اب وہاں وہ پہلی سی رعنائی بھی باقی نہ رہی۔ سعودی عرب سے واپسی پر ذاتی کاروبار بھی کیا لیکن چند وجوہات کی بناء اس باب کو بھی بند کر دینا پڑا۔ کیونکہ کاروبار میں اندیشے بہت ہیں۔ اور اتفاق سے "مرے بچے ابھی چھوٹے بہت ہیں"۔ تنہا آدمی کاروبار کی دیکھ بھال خاطر خواہ پیمانے پر نہیں کر سکتا۔ ویسے اللہ مسبب الاسباب ہے، خیر سے گذر رہی ہے۔ قدیم دوست احباب سعودی عرب میں اپنے اپنے محور پر گھوم رہے ہیں۔ جن میں سے بیشتر راہی وطن ہو چکے ہیں۔ ۱۹۸۶ء سے وہاں گردش لیل و نہار اتنی تیز گام ہے کہ کسی کو کسی کی سدھ ہی نہیں رہی۔ ویسے بھی "وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا"۔ اب حیدر آباد میں مستقلاً قیام پذیر ہوں۔

میرا شغری سفر: کم سنی سے شعر گوئی کا شغف رہا۔ (۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۳ء) آصفیہ لائبریری، افضل گنج میں روز آنہ ۷۳۵ ساعت شام جاتا اور مختلف موضوعاتی کتب بینی میں مشغول رہتا۔ اُن میں ناول، افسانے، تاریخی، اسلامی، مذہبی، سماجی و ادبی کتب زیر مطالعہ رہے۔ ۱۹۶۵ء سے شعر کہنے شروع کیئے۔ اکثر غزلیں روزنامہ رہنمائے دکن میں شائع ہوئیں۔ اُس وقت معزز شاعر جناب خواجہ شوق صاحب، رئیس شعبہ ادب تھے۔ انکی حوصلہ افزائی اور مخصوص ہدایت نے رہبری فرمائی۔ کچھ دن مرحوم جناب حتمی آفندی صاحب سے بھی رموز شاعری سے واقفیت حاصل کی۔ لیکن باضابطہ میں نے کسی کے آگے

زائوئے ادب طے نہیں کیا۔ میں نے غزل و نظم ہر دو صنف میں طبع آزمائی کی۔

سعودی عرب میں محترم مصلح الدین سعدی صاحب و محترم رؤف خلش صاحب کی آمد کے بعد وہاں مشاعروں و جلسوں کا خوبصورت سلسلہ شروع ہوا۔ وہیں ان ہر دو صاحبین و نیز محترم عبداللہ ناظم صاحب و جناب اعتماد صدیقی، بے کس نواز شارق کی حوصلہ افزائی نے مجھ میں تحریک پیدا کی۔ ادنیٰ انجمن ”حلقہ ارباب ذوق“ جدو سے مختلف عہدوں پر وابستگی رہی۔ خصوصاً جناب اعتماد صدیقی و بیکس نواز شارق کے ساتھ جناب مصلح الدین سعدی صاحب، رؤف خلش صاحب اور طارق غازی صاحب (منجنگ ایڈیٹر، سعودی ٹریٹ، جدو) کی سرپرستی میں ہندوپاک کے نامور شعراء کے ساتھ کامیاب مشاعروں کا انعقاد عمل میں آیا۔

۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۵ء کا عرصہ شاعری کا ابتدائی دور تھا جس میں صرف لب و رخسار، گل و گلزار و باغ و بہار کی عکاسی تھی۔ بعد میں بدلتے ہوئے حالات و تجربات کی بناء طبعیت میں عجیب انقلاب پیدا ہوا اور قلم خود بخود حسن و ظرافت کی چاشنی کے بجائے طنزیہ لہجہ اختیار کر گیا۔

ہم کہ تن آسماں تھے پر اے گردش لیل و نہار
جستجو کی دور میں دار و رسن تک آگئے

لہذا اُس دہے کی رنگین شاعری کو میں نے خود ہی نوکری کی نذر کر دیا۔

اس مجموعے کا میں جو تفصیل اور غزلیں ہیں وہ ۱۹۷۶ء سے ۱۹۹۸ء تک آپ بیتی و جگ بیتی کا احاطہ کرتی ہیں۔

اس خصوص میں ارباب مجاز سے ایک درخواست بھی ہے وہ یہ کہ ملک کے موجودہ سیاسی پس منظر میں کبھی ہوئی میری نظموں یا غزلوں کو میری ننداری، وطن دشمنی یا تعصب کا اظہار نہ سمجھیں بلکہ یہ ایک تلخ حقیقت پر مبنی جذبات کا اظہار ہے، جن کا تدارک ہونا زحمت ضروری ہے۔

میں نے بھی کسی سے فکریا غلط نہیں چرائے۔ قدرت نے یہ صلاحیت مجھ میں بدرجہ اتم موجود رکھی ہے۔ زود کو ہوں۔ لیکن میرے کام کا بیشتر حصہ یا تو میں نے خود ہی ضائع کر دیا یا سفر میں وہ خود ہی ضائع ہو گیا۔ جو کچھ بھی تخلیقات میرے اپنے انتخاب میں آئیں۔ وہ اس ”صدائے کرب“ کی شکل میں پیش خدمت ہیں۔

عزیز حسین عزیز

۱۲/ اگست ۱۹۹۸ء



شام کو اچھا نہیں لگتا سحر کا تذکرہ
کس نگر کی بات ہے یہ کس نگر کا تذکرہ
بات اپنے گھر کی ہے یہ اپنے گھر کا تذکرہ
کس ہنر مندی سے کرتا ہے ہنر کا تذکرہ
چھیڑیئے نہ میرے آگے اُس سفر کا تذکرہ
صمد چڑیوں نے پھر چھیڑا ہے گھر کا تذکرہ
خشک لب ہیں اور اُن پر چشم تر کا تذکرہ
پر کسی لب پر نہیں ہے اس خبر کا تذکرہ

چھوڑیئے بھی اہل دل، اہل نظر کا تذکرہ
آج بھی عزت ہے، وقعت ہے خن پر داز کی
زکر اوروں کا نہیں ہے، غیر کا قصہ نہیں
بے ہنر کی ہونہاری پر تعجب کیوں نہ ہو
جس سفر نے فرقتوں کے داغ اس دل کو دیئے
رات ساری گھر کی یادوں کو بھلانے میں کئی
میں تمھیں آخر سناؤں تو سناؤں کس طرح
دوڑتی پھرتی ہیں لاشیں زندگی کی اس میں

وہ صحیفہ ہے یہ خاموشی کہ جس میں آئے عزیز
عمر بھر کی داستاں ہے عمر بھر کا تذکرہ



جتنے سبق دیئے تھے سب یاد ہو گئے ہیں
کیوں باغباں ہمارے صیاد ہو گئے ہیں
دنیا سمجھ رہی ہے آزاد ہو گئے ہیں
ٹوٹے ہوئے دلوں میں آباد ہو گئے ہیں
ارماں کئی سپرد بنیاد ہو گئے ہیں
اک فرد تھا کبھی، اب افراد ہو گئے ہیں !
دیکھو تو پُرزہ پُرزہ اسناد ہو گئے ہیں
فیتنے ہیں کہ ہزاروں ایجاد ہو گئے ہیں
اس آرزو میں کتنے برباد ہو گئے ہیں

میرے حریف میرے استاد ہو گئے ہیں
دیتے تھے خون کل تک، اب خون چوستے ہیں
چھوڑا ہے اُس نے لیکن پر باندھ کر ہمارے
بے خانماں نہ سمجھو کہ ہم قرار بن کے
خوابوں کی یہ عمارت یونہی نہیں کھڑی ہے
تفصیل پوچھتے ہو مجھ سے مرے عدو کی ؟
اک عمر کی کمائی دیمک نے چاٹ کھائی
مُصنف بھی ہیں مُرنے، قانون بھی مُرنا
سب کو عزیز رکھنا ممکن نہیں جہاں میں

ادب میں جمود اور تعطل کا احساس

(ذاتی رائے)

میری دانست میں ادب میں جمود اور تعطل کا احساس روایتی ادب اور ترقی پسند ادب کے حامی ادیب و شاعر کے اپنے اپنے کلام، مضامین و تصانیف کی ہیئت ترکیبی پر شدید اختلاف کا سبب ہے۔ حالانکہ کلاسیکی و تخلیقی توانائی دنیائے ادب کے ہر دور پر اعظم میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ دونوں طریق ادب کے پرستار اس کی اہمیت و افادیت کو بخوبی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے کی تخلیقات پر تنقید و تبصرے کیلئے حدود ادب سے باہر نکل کر، نیو کلیئر توانائی کی مانند ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے آرہے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ گنگا جمنی سنگم نیرنگی آب رواں کی بقاء کی بجائے سرکش موجوں کی طرح فنا فی الآب کا شکار ہو چکا ہے۔ سوچتے و غور و فکر کرنے کیلئے اب صرف یہی بات باقی رہ جاتی ہے کہ یہ طریق خود سری ہر دو طرف کیوں اور کس لینے ہے۔ سب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس صدی کے نصف باب کے دوران مادری زبان (اردو) کئی ہچکولے کھا چکی ہے۔ ۱۹۵۰ء سے قبل فارسی زبان کا مدارس سے اخراج عمل میں آیا جس کی بناء علم و ادب کا ایک ذرین خزانہ ۱۹۳۰ء کے دہے میں عالم وجود میں آنے والی نسل کے ہاتھ نہ لگ سکا اور وہ زبان فارسی و عربی ہر دو کے علم سے محروم ہو گئے۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کے دوران جو نسل وجود میں آئی وہ بتدریج اردو میڈیم سے دور ہوتی چلی گئی جس کی ذمہ داری خود اولیائے طلباء پر عائد ہوتی ہے کہ ہم ہی انگریزی میڈیم کو ترجیح دیں اور بدلتے ہوئے زمانہ کے لحاظ سے اپنے بچوں کو مذہبی، ثقافتی، تہذیبی اقدار سے قطعی تاملد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ بتدریج اردو میڈیم یکسر نظر انداز کر دیا گیا جس کے نتیجے میں آج ہمارے بچے نہ صرف اردو زبان سے ناواقف ہیں بلکہ شعر و ادب کو طنز و نظر سے دیکھتے ہوئے اپنی ہی تہذیب کی دھجیاں اڑانے میں مصروف ہیں۔ ہماری اس نادانی کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں اخلاقیات اور اپنی پرانی تہذیب کے سبھی آثار نئی تہذیب کے اندھیرے میں مدغم ہو گئے۔ آج ہم میں کتنے ایسے اولیائے طلباء ہیں جن کو اپنی اس فاش غلطی کا احساس و اعتراف ہے؟ بے شک ہم بھی اپنی اولاد کے ساتھ نئی تہذیب کی رو میں بہہ کر ماضی کی آنکھ سے بہت دور ہو چکے ہیں۔ ہم میں سے تقریباً ۸۰ فی صد طبقہ خود اپنی ہی تہذیب و اقدار کو حقارت سے دیکھتے ہوئے نئی نسل کو نئے ماحول میں پروان چڑھنے کا کھلا موقع دے رہا ہے۔

یہ بات نہایت خوش آئند ہے کہ اب مختلف گوشوں سے رضا کارانہ طور پر ذی حیثیت اور ذی ہوش اداروں کی جانب سے از سر نو اردو کی تبلیغ و ترویج و تعلیم کے آغاز کیلئے نہایت سرعت سے اقدامات کئے جارہے ہیں۔ بیشک یہ ایک قابل نیک ہے۔ اس طرح کم از کم نئی نسل کو پھر اپنی تہذیبی دھارے میں شامل کرنے کی امید پیدا ہو گئی ہے۔

اسکے علاوہ شاعروں، ادیبوں اور مختلف ادبی انجمنوں کے آپسی خلفشار کے سبب اُردو ادب کی زلف پریشاں بروقت سنواری نہ جاسکی۔ اسکے بجائے ہم ایک دوسرے کے دامن انا کو تار تار کرنے میں اس دم تک برسرِ پیکار ہیں۔ کیا یہ بے جا لغوی تعصب اُردو زبان و ادب کی صحیح و جامع تبلیغ و ترویج کی کاوشوں میں رکاوٹ کا سبب نہیں بنا؟!

سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ نوجوان شاعروں و ادیبوں کو پروان چڑھانے کیلئے اُن کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے ہر دو میدان کے شہسوار اُن پر کسی عقاب کی طرح چھٹ پڑتے ہیں (جیسا کہ وہ کبھی اس دور سے گزرے ہی نہیں!) نتیجتاً کیوں کہ ابتدائی مراحل میں ویسے بھی احساس کم علمی و ناتجربہ کاری کے شکار رہتے ہیں، بجائے اپنے قلم میں سیاہی بھرنے کے اُس کو توڑ کر اس اذیت سے فرار حاصل کرنے میں بی غایت سمجھتے ہیں۔

اس منظر سے ہٹ کر ہم اپنی نظر آج کل بپا ہو رہے ہر روز کی مشاعروں کی طرف مرکوز کرتے ہیں۔ آج کل شعراء ”اور بھی غم ہیں زمانے میں شاعری کے سوا“ کے قول کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مختلف مقامات پر کبوتروں کی طرح اڑتے ہوئے ایک ہی دن میں بی شمار مشاعروں میں اپنا کلام پڑھتے نظر آتے ہیں۔ کیا اس سے اُردو ادب کو معراج نصیب ہوئی یا رسوائی؟! موزوں و غیر موزوں، اہل و نااہل شعراء میں رسالوں و روزناموں میں متواتر اپنی اہم و غیر اہم تخلیقات کی اشاعت کا جنون بھی اس بات کا عکاس ہے کہ ان میں پہچانے جانے کا جذبہ کس حد تک بڑھ چکا ہے! چاہے ادبی ستونوں کی نظر میں وہ پورے اُترتے ہوں یا نہیں؟۔ کیا یہ مکروہ و خلاف آداب نہیں؟! اس طرح ایسے شعراء شاعری کو اپنا اوڑھنا پچھونا بنا کر زندگی کے دیگر اہم امور کی پابجائی سے علانیہ پہلو تہی کرنے میں راق برابری بھی نہیں ہچکچاتے۔

تعجب اس بات کا بھی ہوتا ہے کہ وہ شاعر جو ایک منظوم کلام کا فطری خالق ہوتا ہے، کیوں اُس کی ذاتی زندگی لا اُبالی ولا پرواہی کی شکار رہتی ہے۔ وہ جو خود کہتا ہے کیوں اُس پر عمل پیرا نہیں ہوتا؟ میر و غالب وغیرہ کے زمانے اور تھے، اُن کے کرب اور اُس دور کی اذیتوں کا ہمیں صحیح اندازہ تک نہیں۔ وہ اُردو شاعری کے ایسے عظیم ستون تھے کہ ہم دس پیڑھی تک اُن کی ذات سے متعلق کتاب کا ایک ورق تک نہیں الٹ سکتے۔ حالی و اقبال نے ہمیں چھٹھڑ کر بیدار کرنے میں اپنے آپ کو وقف کر دیا اور ایک نیا انقلاب ہم میں اجاگر ہوا۔ اساتذہ شعراء نے اپنے کلام میں ہر شعبہ حیات پر جامع اظہار خیال کرتے ہوئے ہماری ذہنی صلاحیتوں کو چلا بخشی۔ اور ہم ہیں کہ ایک دوسرے کو بونے سمجھ کر ٹیلوں سے اُتارنے کی شاعری میں مشغول ہیں حالانکہ ان میں بیشتر شعراء نے اپنی ذاتی کاوشوں سے اپنی پہچان آپ بناتے ہوئے اپنے فن کو پروان چڑھانے میں سرگرداں ہیں۔ لیکن اکثر و بیشتر شعراء ایک دوسرے کو حقارت اور شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ بے شک یہ

طریق بے نیازی قابلِ مذمت ہے۔ اور صریحاً یہ سرد مہری، خشک رویہ، اور رشک و حسد خود ایسے شعرا کی تنگ نظری اور خود سری کا ثبوت مہیا کرتا ہے۔

یہاں اس بات کا خلاصہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ مذکورہ بالا تمام اعتراضات کے باوجود خصوصاً حیدر آباد و اضلاع کی بے شمار ادبی انجمنوں نے ایک عرصہ سے اپنی روایتی و تہذیبی اقدار کو نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ پابندی سے کامیاب مشاعروں کو منعقد کرتی ہیں و نیز ادبی اجلاس میں مختلف اہم امور اور موضوعات پر مذاکرہ و مباحثہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حیدر آباد کی میزبانی کے فریضہ ویدہ روئی (شمالی ہند اور پاکستان کے) شعراء حیدر آباد کے مایہ ناز شاعروں کو اسی خلوص سے وہاں مدعو کیوں نہیں کرتے؟! ایک اور بات بُری طرح کھٹک رہی ہے کہ مشاعروں کا انعقاد بھی عالمی سطح پر کچھ کاروباری ذہنیت کے حامل غیر ادبی اصحاب کا پیشہ بن چکا ہے جن کی نظر صرف اُن مشاعروں سے حاصل ہونے والی آمدنی پر ہوتی ہے۔ مصلحتاً اگر یہ لازم و ملزوم ہی قرار پاتا ہے تو کم از کم اس ذریعہ سے حاصل شدہ آمدنی کا کچھ حصہ مستحق شاعروں و ادیبوں کی خدمات کی ستائش و پذیرائی کیلئے وقف کر دینا چاہیئے۔

ارضِ دکن نے بے شمار نامور شاعروں و ادیبوں کو دنیا میں روشناس کروایا ہے لیکن اُن میں سے بیشتر عالمی سطح تو گنجائش خود اپنے ہی ملک کے حدود تک بھی اپنی رسائی و شناسائی نہیں کروا سکے۔ اس میں اُنکا قصور نہیں، بلکہ یہ بات تو اُن کی خود داری کی عکاس ہے۔ یہ فریضہ تو مقامی و علاقائی ادبی انجمنوں کا ہے کہ وہ ملکی و عالمی سطح پر اپنے روابط وسیع کرتے ہوئے ایسے شاعروں و ادیبوں کا تعارف کروائیں اور اُنکے فن کی تبلیغ و اشاعت میں مدد و معاون ثابت ہوں۔

اکثر مشاعروں میں آجکل شعراء ہی سامعین ہیں۔ کیا بات ہے کہ سنجیدہ سخن شناس سامعین کیوں مشاعروں میں نظر نہیں آتے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اکثر صدر مشاعرہ و مہمانان خصوصی عادتاً دیر سے مشاعرہ گاہ پہنچنے میں ہی اپنی قد آوری کے پنہاں ہونے کے شبہات میں مبتلا رہتے ہیں۔ وقت کی پابندی کے علاوہ مذکورہ بالا اعتراضات سے پاک و خوشگوار ماحول میں مشاعروں کا انعقاد عمل میں لایا جائے تو سخن پرور سامعین بھی اپنے ذوق کی تسکین کیلئے شرکت کریں گے جن کا آج کل محفلوں میں فقدان ہے۔

عزیز حسین عزیز

۱۱/۱۲ اگست ۱۹۹۸ء

ہر رُکاوٹ کو ہوا کا سر پھرا جھونکا کہیں
 سامنے دیوار بھی آئے تو دروازہ کہیں
 بات کو سُننے ، سمجھنے کے زمانے لڈ گئے
 اب یہ عالم ہے تو کہیں ہم کسی سے کیا نہیں
 جب خموشی توڑنا چاہی تو دُنیا نے کہا
 یہ گذارش ہے جواباً ، ہاں کہیں یا نا کہیں
 تلخیاں شیریں کلامی کا اگر ہوں ماحصل
 اُن کو اپنی خُوش فہمی کا خمیازہ کہیں
 اب کئی چہروں کا ممالک بن گیا ہے آدمی !
 کون سے چہرے کو اُس کی ذات کا چہرہ کہیں !؟
 گو وجود اس کا نہیں رکھتا کوئی مصرف مگر
 اپنے سائے کو بھی اپنے جسم کا حصّہ کہیں
 یوں تو ہم سب ایک ہی منزل کے راہی ہیں مگر
 اپنی اپنی راہ پر کیوں گامزن ہیں کیا کہیں
 نبھتے شعلوں کی جسارت اڑ گئی بن کر دُھواں
 ان چمکتی لکڑیوں کو راہ کا ملبہ کہیں
 وہ رگِ جاں سے قریں ہے پر نظر سے دور تر
 کوئی بتلائے کہ اس کو کونسا رشتہ کہیں
 ہر نمائش میں چمکتی ہیں سبھی اشیاء عزیز
 جو کسوٹی پر کھرا اترے اُسے سونا کہیں

حمد

عطا کرتا ہے جب تو ہی تو اپنے دل سے کیا مانگوں تو داتا ہے تو دیتا ہے تو پھر محفل سے کیا مانگوں
 ترا ساون، تری کر نیں، تری مٹی، تری کھیتی یہ فضلیں کیا مجھ دیں گی میں اب وگل سے کیا مانگوں
 جو کچھ پایا تو کیا پایا، جو کچھ کھویا تو کیا کھویا یہ عالم ہے تو پھر اس سسٹی للاحاصل سے کیا مانگوں
 ہر اک رستہ پہیلی ہے، ہر اک منزل مقمہ ہے کسی رستے پہ کیا ڈھونڈوں، کسی منزل سے کیا مانگوں
 کسی ساگر کی طرح تو سدا بیدار رہتا ہے مزا ناچھی ہے غفلت میں تو اس غافل سے کیا مانگوں
 لبو کا آخری قطرہ بھی پی کر جو پیاسا ہے میں اپنی آخری خواہش میں اُس قاتل سے کیا مانگوں
 میں حق کے واسطے سارا اثاثہ دیکے بیٹھا ہوں کوئی اب یہ کہے اس حال میں باطل سے کیا مانگوں
 الہی دین و دنیا میں ہمیں تو سرخرو کر دے یہی اک آرزوئے دل ہے تو پھر دل سے کیا مانگوں
 مرا مطلوب تو ہے، پھر طلب کی کیا ضرورت ہے سمندر مل گیا مجھ کو لب ساحل سے کیا مانگوں

ظہور آفتابِ کل سے روشن ہے جہاں سارا

عزیز اس روز روشن میں مدِ کامل سے کیا مانگوں

۱۔ مانجھی = ضمیر ۲۔ قاتل = ابلیس

۳۔ آفتابِ کل۔ ذاتِ باری تعالیٰ ۴۔ مدِ کامل = دنیائے دوں

حمد

روشنی آپ ہیں دیا ہوں میں آپ کے دم سے جل رہا ہوں میں
 میں کسی کا نہیں ہوں دنیا میں آپ کا صرف آپ کا ہوں میں
 آئینہ رکھ کے روبرو اپنے آپکا حُسن دیکھتا ہوں میں
 آپ ہیں سحر بے کنار مگر ایک قطرہ ہوں اور کیا ہوں میں
 یہ بہاریں ہیں آپ کے دم سے میرا کیا ہے کہ اک ہوا ہوں میں
 یہی بستی ہے آپ کی خاص آپ منزل ہیں ، راستہ ہوں میں
 سارا قصہ ہے آپ کا قصہ ابتداء ہوں نہ انتہا ہوں میں
 بے خبر بن سہی سمندر سے ناؤ کا اپنی ناخدا ہوں میں
 صبح آئی عزیز گل کرنے
 شب کو محفل میں جل چکا ہوں



فقط یہ جوشِ رحمت ہے اُبلتا ہے جو صدیوں سے
 اگر عرفان ہو تو چشمِ زم زم کو پہچانو
 محبت ہی کے دم سے ہے وجودِ ہستی آدم
 ہے جس کے دم قدم سے دم میں دم اُس دم کو پہچانو

نعت شریف

اس کائنات میں ہیں جلوہ نما محمد
شام و سحر ہیں کب سے نغمہ سرا محمد
شمس و قمر میں پنہاں ہے نور آپ ہی کا
ہیں آپ ہی سراپا نورِ خدا محمد
شمس الضحیٰ محمد ، بدر الدجی محمد
رمز خدا محمد ، وصفِ خدا محمد
مکے کے سب بتوں کو توڑا ہے آپ ہی نے
اب تک پکارتا ہے غارِ حرا محمد
ہے ان کے دم قدم سے ایمان کی حرارت
صدیقؑ و عمرؓ ، عثمانؓ ، شیر خدا ، محمد
تھی انبیاء کے دل میں دیدارِ حق کی حسرت
معراج کو یوں پہنچے عرشِ علی محمد
ذاتِ رسولِ اکرم تقریر میں نہ آئے
یہ نعت ہوئی لیکن بے ساختہ محمد
یثرب کی سرزمین پر ہیں آپ کے کفِ پا
پلکوں پہ کھینچ لایا جذبہ مرا محمد
وہ رمزِ عشقِ خود میں آقا کہاں سے لاؤں
اشکوں سے آج اپنا منہ دھولیا محمد
میں خوش نصیب ہوں کہ طیبہ کو آچکا ہوں
پھر بھی ہوں حاضری کا مشتاق یا محمد
کافی ہے عاصیوں کو کوثر کا ایک قطرہ
رکھنا عزیز پر بھی چشمِ عطا محمد

صل علی محمد ، صل علی محمد
صل علی محمد ، صل علی محمد
کعبہ ہے آپ ہی کا ، ہے طور آپ ہی کا
صل علی محمد ، صل علی محمد
خیر الوری محمد ، نور الہدی محمد
صل علی محمد ، صل علی محمد
کافر کے دل میں ایماں پھونکا ہے آپ ہی نے
صل علی محمد ، صل علی محمد
موقوف ہے انہیں پر اسلام کی عمارت
صل علی محمد ، صل علی محمد
حق کو مگر تھی چاہت دیدارِ مصطفیٰ کی
صل علی محمد ، صل علی محمد
نعتِ رسولِ اکرم تحریر میں نہ آئے
صل علی محمد ، صل علی محمد
حیراں تھا چل کے جاؤں میں آستان پہ بیٹے
صل علی محمد ، صل علی محمد
الفاظ کی کمی ہے ، معنی کہاں سے لاؤں
صل علی محمد ، صل علی محمد
آقا کے آستان پر پلکیں بچھا چکا ہوں
صل علی محمد ، صل علی محمد
سب منتظر رہیں گے محشر کے روز آقا
صل علی محمد ، صل علی محمد

نعت شریف

دیدہ بینا اگر ہو وا دلِ بیدار کا
لا الہ سے ہے الا اللہ تک حق کا بیاں
اندھی آنکھوں میں وہ تابش اور وہ بینائی کہاں
ذہن و دل کو پاک تو کر لو ہواک تکثیف سے
ذاتِ احمد ہی تو ہے یہ علم کا شہرِ بقا
آپ کی سنت کے آگے آئینہ کیا چیز ہے!
سوزن پرکار یوں تو ہے مدینے میں مگر
بزمِ ہستی اُس چراغِ آرزو کا ہے سبب
وسعت و حد، قامت و قد سے عمر ۲ ہیں حضور
ظاہر و باطن وہی ہیں اول و آخر وہی
اُس کی بنیاد و بلندی کی نہیں ہے حد کوئی
فرشِ خانی سے نبی کا عرشِ اعظم کا سفر
لا کے سدرۃ تک کہا معراج میں جبریل نے
قافلے ہیں راہِ عصیاں میں بھٹکنے کیلئے
آپ ہی کے عشق میں پنہاں ہے لطفِ بندگی
مجھ میں لاکھوں عیب ہیں اور تو ہے ستارِ العیوب

دربدر کیوں پھر رہا ہے فکرِ یزداں میں عزیز

ایک ہی تو ہے وسیلہ احمد مختار کا

نعتِ شریف

ہو مری زندگی مدینے میں یا نبی یا نبی مدینے میں
 بن گئی زندگی کا سرمایہ جو گٹری کٹ گئی مدینے میں
 اُن کے روضے کو دیکھتے رہنا مشغلہ ہے یہی مدینے میں
 جاں بہ لب تھے غموں سے ہم لیکن دل کو راحت ملی یہ میں
 سارے عالم میں نور ہے اُس کا وہ شمع جل اُٹھی مدینے میں
 ہے جو مکہ میں نور کا عالم ہو بہ ہو ہے وہی مدینے میں
 میں کہاں اور کہاں یہ در لیکن حیثیت بڑھ گئی مدینے میں
 کوٹ کر آگئے ہیں ہم آقا زندگی رہ گئی مدینے میں
 سرفرازی عزیز ہے اُس کی
 جو جیں جھک گئی مدینے میں



ایک شعر

ذرا جی بھر کے اِس عالم کی پہلے سیر تو کر لو
 اگر توفیق ہو پھر سروِ عالم کو پہچانو

نذرانہ عقیدت

(خلفائے راشدین اور اولیاء اللہ کو)

نہ ولداری سے ملتی ہے نہ بھکاری سے ملتی ہے
 فتح یابی عمرؓ کی صوتِ یا ساری سے ملتی ہے
 وفاداری کسی کی ہی سہی آدم سے اس دم تک
 کہاں صدیقؓ اکبر کی وفاداری سے ملتی ہے
 جسے پاکیزگی کہتے ہیں کجی ہے وہ ایمان کی
 وہ عثمانؓ غنیؓ جیسی حیداری سے ملتی ہے
 شہادت، فقر و فاقہ، سادگی، صبر و رضا کی داد
 علیؓ، آل علیؓ کو رحمتِ باری سے ملتی ہے
 اگر بے شکل کوئی شے ہو تو اچھی نہیں لگتی
 ہر ایک صورتِ موصوٰر کی وفاداری سے ملتی ہے
 فقیروں کی نگاہیں تو اسے دھتکار دیتی ہیں
 امیروں کو یہ دنیا زورِ سالاری سے ملتی ہے
 قدم پہلے اٹھا جس کا اسی کو مل گئی نعمت
 یہ خیراتِ الہی بھی کہیں باری سے ملتی ہے !
 اسے بے فیض مت جانو کہ دنیا راہِ عقبے ہے
 مگر یہ دولتِ بے حد تو بیداری سے ملتی ہے
 اسے اک خوابِ مت سمجھو کہ دوزخِ اک حقیقت ہے
 کہ ہر نوری کو یہ عبرت کسی ناری سے ملتی ہے
 حقیر اس کو نہ جانو کہ بلا ہے یہ قیامت کی
 کہ شعلے کو توانائی بھی چھگاری سے ملتی ہے
 بھٹاؤں سے نہیں ملتی یہ میراثِ جہانگیری
 عزیزِ عزت و عظمت تو وفاداری سے ملتی ہے

(نذرانہ عقیدت)

بارگاہ حسین ابن علیؑ میں

مِلانے آنکھ پرستارِ شر سے جاتا ہے
وہ دینِ حق کا امیں کس اثر سے جاتا ہے
وہ جس گھرانے سے تشنہ لبوں کی پیاس نبھتی
اُسی کی رسم نبھانے وہ گھر سے جاتا ہے
وہ جس کے خاکِ قدم میں تھا یہ جہانِ نعیم
وہ بے نیاز ہر اک بام و در سے جاتا ہے
برائے نام بہتر نفوس ساتھ لیتے
وہ کون ہے جو تری رہ گزر سے جاتا ہے
نہ سیم و زر کی تمنا نہ آس دُنیا کی
یہ قافلہ تو بڑے کروفر سے جاتا ہے
وہ جس پہ ٹوٹ پڑے تھے معوبتوں کے پہاڑ
عدو کے زخموں میں کس دل جگر سے جاتا ہے
وہ جس کے سر پہ تھا اتمامِ گفتگو کا مدار
وہ سرفروش کہاں چشمِ تر سے جاتا ہے
رہ جہاں کی طرف بڑھ سکا نہ جس کا قدم
خُدا کی راہ میں نیزے پہ سر سے جاتا ہے
ہوا نہ ختم مگر وقتِ شام سے پہلے
وہ کام جس کیلئے وہ سحر سے جاتا ہے
متاعِ لوح و قلم ہو وہ جس کی مٹھتی میں
وہی تو شانِ فقیری میں سر سے جاتا ہے
وہ آفتابِ جو ڈوبا تو ماہتابِ عزیز
پروں میں ابرِ کرم کے ادھر سے جاتا ہے

۱۔ آفتاب = حضرت امام حسینؑ ۲۔ ماہتاب = حضرت امام زین العابدینؑ

﴿رُودادِ آدم﴾

آدمی مُشتِ خاک کا خاکہ شن بدن ، رُوحِ پاک کا خاکہ
 فکر و دانش ، وقار کی صورت ذہن و دل ، آنکھ ، ناک کا خاکہ
 ایک دریا ہے بند کوزے میں بحر آئیں ہے چاک کا خاکہ
 یہ تگ و تازِ اس کی فطرت ہے آتش افروز خاک کا خاکہ
 عشق کی آگ ، حُسن کا دریا آب و آتش و خاک کا خاکہ
 روزِ اوّل تھا اُس کی آمد پر محفلِ مُرتپاک کا خاکہ
 کُنتِ کُترِ و خُفّیّ کا راز وَجِدِ حق رقصِ خاک کا خاکہ
 حکمتِ عِزّ وجل کا اک پیکر قُدرتِ ذاتِ پاک کا خاکہ
 بن گیا دُھندلی دُھندلی راہوں سے منزلِ تابناک کا خاکہ
 جادۂ ذوق و شوق کا نقشہ صُورتِ انہماک کا خاکہ
 بٹ گیا جانے کیوں قبیلوں میں نسل در نسل ناک کا خاکہ
 رفتہ رفتہ بکھر گیا آخر باہمی اشتراک کا خاکہ
 خوانِ دُنیا پہ ٹوٹ کر گرنا منظرِ کربناک کا خاکہ
 ہو گیا داغ داغ لُحُوں میں اس کی پوشاکِ پاک کا خاکہ
 ہے یہ انجامِ ایک لغزش کا دامنِ چاک چاک کا خاکہ
 دُھل گیا اس کی آنکھ سے شاید محشرِ ہولناک کا خاکہ
 دیدنی ہے عزیزِ تربت پر دردتِ درد کا خاکہ
 رَحلتِ درد کا خاکہ

تنقید پر تنقید

اے نقیبِ فکر و دانش ہوش کا پیکر تو بن
معنی و الفاظ کی بیساکھیوں کو توڑ کر
منزلِ فکر و نظر کے راستے ہیں پُر خطر
دور تک رستہ نظر آتا نہیں ہے دشت میں
یوں سرِ منبر مجھے گھائل تو کر سکتا ہے تو
تو حلق پر پَحل تو سکتا ہے چھری بن کر مگر
آینوں پر سنگباری کی یہ خو اچھی نہیں
حسنِ فطرت کھل اٹھا ہے آپ اپنی ذات سے
اس اندھیری رات کو درکار ہے اک ماہتاب

دل دکھانے سے ذرا پہلے مرا دلبر تو بن
چھو سکے جو فکر کی پرواز کو وہ پُر تو بن
میں مسافر بن چکا ہوں تو مرا رہبر تو بن
تجھ کو دعویٰ ہے تو پہلے قائدِ لشکر تو بن
بٹ مرے رستے سے پہلے میل کا پتھر تو بن
جو اتر جائے مرے سینے میں وہ خنجر تو بن
شیشہ گر کیا بن سکے گا تو بھلا، آزر تو بن
برق بن کر ٹوٹنے والے کبھی منظر تو بن
بن سکا نہ ماہِ کامل، نا سہی، اختر تو بن

میں فرشتہ تو نہیں ہوں عیب سے عاری عزیز

چھوڑ دے دعویٰ خدائی کا تو کبھیغیر تو بن



یہ شعلہ ہے خود اپنے ظرف کی گرمی سے جلتا ہے
ہو واجبِ رقص کرتی ہے تو بے شرمی سے جلتا ہے
چراغوں کے کھلے سر پر ذرا فانوس تو رکھ دو
یہی بہکا ہوا شعلہ بڑی نرمی سے جلتا ہے



عزیز حسین





شاعری کی دُسن ہے طاری پھر وہی دیوانگی
 پھر جنون یاد یاری پھر وہی دیوانگی
 پھر لب و رخسار کی لالی نے چھیڑی ہے غزل
 پھر خرد کو نیند آجاتا ، بُنوں کا جاگنا
 فاعلائن ، فاعلائن ، فاعلائن ، فاعلن
 کورے کانڈ اور قلم کو پھر سجانا میز پر
 بیٹھے بیٹھے سیر کرنا عالمِ احساس کی
 پھر انہی رستے ہوئے زخموں کے مرہم کی تلاش
 پھر اُسی بنجر زمیں پر بل چلانا رات دن
 حادثاتِ زندگی سے دل لگانا دن تمام
 میکدے کی سمت بڑھنا زندگی سے بار کر
 پھر طلوع ہونا فلک پر محمد خورشید کا

فکر و فن کی شہسواری پھر وہی دیوانگی
 پھر وہی تصویرِ پیاری پھر وہی دیوانگی
 پھر وہی مستی کنواری پھر وہی دیوانگی
 پھر وہی وحشت ہے طاری پھر وہی دیوانگی
 لب پہ ہے جاری وساری پھر وہی دیوانگی
 پھر وہی کُرسی ہماری پھر وہی دیوانگی
 پھر وہی اختر شماری پھر وہی دیوانگی
 پھر اُمیدِ نغمساری پھر وہی دیوانگی
 پھر لبو کی آبیاری پھر وہی دیوانگی
 جاگنا پھر رات ساری پھر وہی دیوانگی
 پھر وہی ناپائیداری پھر وہی دیوانگی
 پھر اُمورِ خانہ داری پھر وہی دیوانگی

کچھ مل ہے داؤدِ تحسین سامعین سے اے عزیز
 اور کچھ تنقیدِ قاری پھر وہی دیوانگی



کب تک یہ کہو اپنی نگاہوں سے گروں میں
گھس گھس کے پرکھتا ہے کسوٹی پہ زمانہ
مٹی تو میری ذات ہے گھٹی میں پڑی ہے
مٹی میں مِلوں شخم کی صورت تو نہیں غم
ہاتھوں کی لکیروں کو خدا میں نے کہا کب
یگودی ہوئی موجوں کا تقاضہ تو یہی ہے
اک آنکھ نہ بھائی یہ وفا اہل وفا کو
وہ خط و کتابت کے زمانے تو گئے بیت
پس جاؤں میں پتھر پہ خموشی سے، خوشی سے
کیا کچھ ترے قبضے میں نہیں قادرِ مطلق
اتنا نہ گرا دے کہ ملے خاک میں عزت

ہیرا ہوں، مہاجن کی تجوری میں رہوں میں؟
سونا ہوں تو کیوں سب کی نگاہوں میں چھوؤں میں؟
مختصر جو بنوں اب تو کہو کیسے بنوں میں؟
خسرت ہے کہ پھر شاخ پہ گل بنے کھلوں میں!
منزل تو مقابل ہے جو دو گام چلوں میں!
لوٹی ہوئی کشتی لینے دریا میں پھروں میں!
رکھتا ہوں اسے دل میں بہ اندازِ جنوں میں!
نظروں سے پڑھیں آپ جو آنکھوں سے کہوں میں
پہیں جو انہیں ہاتھوں میں پھر رنگ بھروں میں؟
سجدے میں گروں اور تہی ہاتھ اٹھوں میں؟؟
اتنا نہ اٹھا دے کہ ستاروں پہ چلوں میں

— دے کہ یہ آنسو ہی تو ہم ہیں عزیز اب

آنکھوں میں جو آجائیں تو پلکوں سے چُنوں میں



میری روداد مرے عیب و ہنر تک پڑھئے
میں بہت کچھ ہوں مگر حرفِ بشر تک پڑھئے
شب کی تنہائی میں زخموں کا صحیفہ لیکر
بھولی ب سری ہوئی یادوں کو سحر تک پڑھئے
ایک اک حرف سے بہتی ہیں لہو کی ندیاں
بس تباہی ہی تباہی ہے جدھر تک پڑھئے
صرف چہرے ہی کو پڑھتے ہو، غضب کرتے ہو
کیا بھروسہ ہے، زمانے کی نظر تک پڑھئے
حال ہر موج پریشاں کا سمجھنے کیلئے
کشفِ ساحل سے کراماتِ بھنور تک پڑھئے
قصرِ دیوان کے پر شکوہ حقائق ہیں مگر
ان حکایات کو آثارِ کھنڈر تک پڑھئے
اپنے کہسار میں شاہیں کو پہنچنے کیلئے
زخم کتنے ہیں لگے پاؤں سے پر تک پڑھئے
غور سے سنیئے شبِ غم میں اذیت کا جرس
اُس کے ہر ذکر کو امکانِ گجر تک پڑھئے
سانس کیا چیز ہے اک رابطہ موت و حیات
اک امانت ہے مگر حدِ نظر تک پڑھئے
زیست اک درسِ محبت ہے، عبادت ہے عزیز
اس کو آغاز سے انجامِ سفر تک پڑھئے



تو تو پتھر کا صنم ہے ، جانتا ہوں یہ کروں
 تو مری آنکھوں کی ان دو پتلیوں میں ہے تو کیا
 آپ خود ہستی مری اندر ہی اندر بچھ گئی
 تو کہ مجھ سے واسطہ رکھ کر بھی یوں انجان ہے
 گو مرا دل ایک چشمہ ہی سہی سوکھا ہوا
 میں کہ اک ذرہ خدا یا اور یہ روزی یہ بتا
 اپنے دامن کی تو کب کی اڑ چکی ہیں دھجیاں
 جھیل کے پانی پہ رقصاں ہے شفق کی روشنی
 حوصلہ یہ تند موجوں میں بھی شاید ہو نہ ہو
 موم بن کر تو پگھل جائے تو میں پوجا کروں
 میرے آگے آئینہ رکھ دے تو میں دیکھا کروں
 روشنی پھیلی ہوئی ہے شہر میں تو کیا کروں
 اُس پہ پابندی ہے تیری راہ میں دیکھا کروں !
 جو سرِ مژگاں ہے اک قطرہ اُسے دریا کروں ؟
 تو مجھے پیدا کرے اور میں اسے پیدا کروں ؟
 اک سلامت ہے گریباں بھی تو اُس کا کیا کروں !
 پھینک کر کنکر کوئی موجوں کو شرمندہ کروں ؟ !
 بلبلُا ہو کر بھی میں طوفان سے کھیلا کروں !

یہ معمہ حل نہیں ہوتا ہے مجھ سے اے عزیز

وہ تو میرے سامنے ہے ، یاد میں کیسا کروں !



میں ہوں وہ مُسافرِ وقت کہ جسے گھر نہ در کی تلاش ہے
 مری منزلوں سے جو دُور ہو اُسی رہ گزr کی تلاش ہے
 تری اک جھلک کی اُمید پر جنہیں ہم نے دیکھا ہے عمر بھر
 یہ نگاہ شوقِ جمال کو اُنہیں بام و در کی تلاش ہے
 جو چُھپا درونِ نقاب ہے ، وہ جمالِ زہرہ مثال کو
 جسے ہے کمالِ مشاہدہ ، اُسی دیدہ ور کی تلاش ہے
 سرِ بام طائرِ حرص کے میں نے پر کتر کے تو رکھ دیئے
 مجھے روکنے کی ہے آرزو ، اُسے بال و پر کی تلاش ہے
 کڑی دوپہر کی وہ دُھوپ تھی ، میں کھڑا ہوا تھا شجر تلے
 تو یہ باغبان کو شک ہوا کہ مجھے شمر کی تلاش ہے
 ہوا کلڑے کلڑے نصیب سے دلِ نامراد کا آئینہ
 اسے پھر جو پہلی سی شکل دے اُسی شیشہ گر کی تلاش ہے
 جو لکھا ہوا ہے کتاب میں ، وہ حساب میرے نصاب کا
 وہی دلِ شگستہ کلام ہی میری عمر بھی کی تلاش ہے
 وہ مُنافقوں کا تھا قافلہ ، اُنہیں کون حق پہ ہیں کیا پتہ
 میں ہوں اُن کے گھر کی تلاش میں ، اُنہیں میرے سر کی تلاش ہے
 یہاں بادشاہ فقیر ہیں ، ترے در کے آگے حقیر ہیں
 ترا درِ نصیب سے مل گیا یہی درِ بدر کی تلاش ہے
 اے عزیز بعدِ وصال بھی ، رہے جن میں گرمیِ زندگی
 بخدا زمانہِ حال کو ، اُنہی دل ، جگر کی تلاش ہے



زینت ہے ہر زحمتِ حد سے گذر جانے کا نام
اعترافِ لغزشِ پاکیا ہے، ہم سے پوچھے
ایک ہی در کے تجسس میں نکلنا ہے سفر
عشق ہے بس حُسن کی لَو میں بکھر جانے کی بات
بے خبر داتا نہیں ہے کہ طلب کرنے پہ دے
ہر طمع سے بے نیازی ہے قلندر کی صفت
ہے اہامتِ سوئے حق یکسوئیِ قلبِ و ذہن
اخلاطِ حَرَف و معنی کیا ہے، تقہیبی جواز

یہ نموشی ہے فنِ نادرِ جہاں میں اے عزیز

لب کشائی بیٹھے ہی بنر جانے کا نام



تو ہے مضطرب اے زائد، پس اضطراب کیا ہے
تجھ ہے خبر کہ ہستی ہے رضائے حق میں مخفی
جو صحیفہٴ خرد ہے اُسے کھول کر تو پڑھ لے
یہ حیاتِ بندگی ہے، وہ متاعِ زندگانی
کبھی تو خوشی سے پاگل، کبھی غم سے تو ہے بوجھل
شب و روز کا یہ کھکا ہے حرام، یہ خبر ہے
سر دار تو عیاں ہے، پس طور تو نہاں ہے
مجھے ہے قبولِ خلوت، نہ یہ پوچھ مجھ سے لیکن

اے عزیز میں رہوں گا دمِ حشر تک نزع میں

یہ عتاب کم نہیں ہے کہ مرا حساب کیا ہے

کوئی گر یہ تجھ سے پوچھے تو برا جواب کیا ہے
تو یہ خوف کیوں ہے تجھ کو کہ مآلِ خواب کیا ہے
کہ ترا نصیب کیا ہے، کہ ترا انصاف کیا ہے
مرے دل مجھے بتا دے برا انتخاب کیا ہے
سر آسماں بھی رہ کر یہ ادا سحاب کیا ہے
مگر ایسے وسوسوں کا کہو سدِ باب کیا ہے
کہیں بے حجاب تو ہے، کہیں یہ حجاب کیا ہے!
ترے حسنِ بے بہا سے مرا انتساب کیا ہے



امنِ عالم کے پیہر اور لڑنے میں ہیں ہم!
خود تماشائی بھی ہیں اور خود تماشے میں ہیں ہم!
اس سفینے سے ہیں باہر یا سفینے میں ہیں ہم!
پنچہ بیداد کے ایسے شکنجے میں ہیں ہم!
ریت یہ سمجھا رہی ہے اب جزیرے میں ہیں ہم
سر پہ سورج ہے ندامت کے پسینے میں ہیں ہم
دیکھنا یہ ہیکہ آخر کیوں اندھیرے میں ہیں ہم!

زینتِ تاجِ حمیت تھا وہ ہیرا تھے عزیز
اب خدا جانے کہاں اور کس دھن میں ہیں ہم!



سبب ہم کو ہماری بے بسی کامل گیا ہوتا
تو سیدھا راستہ اس زندگی کا مل گیا ہوتا
تدبر سے خزانہ ہر خوشی کا مل گیا ہوتا
ترے دستِ تہی کو دل سخی کا مل گیا ہوتا
صدائے دل کو نغمہ عاشقی کا مل گیا ہوتا
نشاں رہزن کو انکی تیرگی کا مل گیا ہوتا
پتہ دشتِ جنوں میں آدمی کا مل گیا ہوتا
جو قسمت سے پتہ تیری گلی کا مل گیا ہوتا

شعور و حوصلہ گر آگہی کامل گیا ہوتا
بلندی اور پستی کی حقیقت پر نظر جاتی
غم ہستی ہی سے ہستی ہے، گر ہم یہ سمجھ لیتے
اگر احساس کی نعت کو یوں ضائع نہیں کرتا
نظر گر حسن کے جلووں کو خود میں جذب کر لیتی
نہ بھرتی مانگ راہوں کی اگر آوارگی میری
نہ ہوتا یہ بھرم کے آدمی رہتے ہیں شہروں میں
بھٹکتا کیوں میں در در چھانتا کیوں خاک صحرا کی

نکل آتے جو ہم باہر حصارِ ذات سے اپنی
عزیز ہم کو صلہ اس بے خودی کا مل گیا ہوتا



مَسْجِدِ مَکِئَہ ، بیمار ہیں لا
 ادھر لا مئے یہاں میخوار ہیں لا
 اُجالے میں نہیں پی سکتے ساقی
 خُدارا صبح کے آثار ہیں لا
 اسی مرہم کی ہم کو جستجو تھی
 ہمارے زخمِ ناہموار ہیں لا
 صراحی ہو یا کوزہ ہو کہ کاسہ
 یہ سب پانی کے حصہ دار ہیں لا
 سُبُو لے لے مجھے تلوار دے دے
 یہاں سب درپے آزار ہیں لا
 کہاں رکھی ہے سیڑھی یہ بتادے
 پڑوسی ہیں کہ یہ مینار ہیں لا
 مرا چشمہ نہیں ملتا ہے مجھ کو
 مناظرِ قابلِ دیدار ہیں لا
 ذرا مجھ کو مری بیساکھیاں دے
 مسافر اب صبا رفتار ہیں لا
 مرے ہاتھوں میں قرطاس و قلم دے
 یہ صاحبِ عالم ذخار ہیں لا
 نہ ڈالوں کیوں نہ اُن کے منہ پہ تالا
 دراڑیں بولتی دیوار ہیں لا
 جھُلا مت سامنے سُولی کا پھندہ
 عزیز ہم عاشقانِ دار ہیں لا



سب کو ملتی ہے کب خوشی یوں بھی غم سے گھبرا گئے تو حیرت کیا
 مل بھی جائے تو کچھ نہیں حاصل جان لیوا سہی مگر ہمد
 ہوش مندی ہے اور نہ بے ہوشی دل میں احساسِ پائمانی ہے
 وہ جو بدلے تو کیا تعجب ہے تلخیوں سے ہیں پُر تری باتیں
 اب سیاہی کا دور دورہ ہے جسم پھولوں میں مضطرب سا ہے
 کج کلاہی عزیز وہ جانیں ہے بھلی ہم کو سادگی یوں بھی



خوابوں کا پیر ہن ہے خیالوں کا پیر ہن ہلکے سے ایک لمس سے خوشبو مہک اُٹھی
 شائد گھٹائیں ٹوٹ کے برسی ہیں رات بھر دھونا مگر حضور بڑی احتیاط سے
 عیبوں کو ڈھانکنے کا سلیقہ نہیں اسے کیسے سیوگے دامنِ قسمت ہے تار تار
 یہ کیسا انقلابِ زمانہ ہے دوستو !
 زیبِ دل و نظر ہے سراپوں کا پیر ہن پھولوں سا پیر ہن ہے حسینوں کا پیر ہن
 بھیگا ہوا ہے آپکی آنکھوں کا پیر ہن دیکھو، بہت لطیف ہے رُخسوں کا پیر ہن
 بس تن کو ڈھانکتا ہے غریبوں کا پیر ہن ناقابلِ رفو ہے نصیبوں کا پیر ہن
 ہر روز مختلف ہے عذابوں کا پیر ہن
 دل میں یہ آرزو ہے کہ یونہی رہے عزیز
 اس پھول سے پیکر یہ محابوں کا پیر ہن

۱۹۷۶ء میں سعودی عرب کو روانگی کے بعد۔۔ رفیق حیات کا انتباہ

جو زندگی کے سفر میں آئیں وہ دشت و صحرا کھنگال رکھنا
مگر ٹراماں نسیم صبح کی طرح بے باک چال رکھنا
کسی کو کوئی جواب دینا نہ لب پہ کوئی سوال رکھنا
یہ اسلحے سب بناوٹی ہیں نہ تیغ رکھنا نہ ڈھال رکھنا
ہوا مخالف ، جہاں مخالف ، زمیں مخالف ، زماں مخالف
یہ موسم اختلاف ہے تم زبان اپنی سنبھال رکھنا
یہ دل کا شیشہ نہ ٹوٹ جائے ، نہ دھول آئے ، نہ میل آئے
کہیں نہ ہاتھوں سے مچھوٹ جائے ، سفر میں اس کا خیال رکھنا
نئی رُتوں کی ہوا لگے تو اسے بھی باہوں میں لے اڑے گی
گئی رُتوں کی مہک ہیں یادیں ، دل حزیں میں سنبھال رکھنا
سنا ہے وہ سیم و زر کی بستی ، جہاں بلندی میں بھی ہے پستی
انہیں مبارک غرور و مستی ، نہ دل پہ اس کا ملال رکھنا
ہوا کے بل پر جو شئے اڑے گی ، کہیں کسی جاوہ جاگرے گی
عروج پر ہر قدم ہو لیکن نظر میں جائے زوال رکھنا
کوئی جو دیکھے ، نہ پوچھ بیٹھے ، یہ حال کیسا بنالیا ہے
نہ شخصیت ہو تمھاری رسوا یوں غم میں خود کو نہ ڈھال رکھنا
اُداسیوں کا جو سامنا ہو تو قہقہوں کے نشے میں جھومو
مصیبتیں تو لگی ہوئی ہیں جسارتوں کو بھی پال رکھنا
تمھاری راہوں کو تک رہے ہیں ، تمھاری یادوں میں جی رہے ہیں
عزیز ہو تم سبھی کے لیکن ہمارا بھی کچھ خیال رکھنا



گھر سے نکلے تھے اُنڈھٹی خوشی کیلئے
دیدہ ور غم ملے رہبری کیلئے
حاجتوں تے ہمیں ہجرتیں سوئپ دیں
گھٹ کے مرنا پڑا زندگی کیلئے
نقصِ تدبیر و تقدیر کیا چیز ہے
ہم سزاوار ہیں خود کشی کیلئے
ڈیڈی آجائے اب وطن لوٹ کر
میں نکل جاؤں گا نوکری کیلئے
اس طرف بے بسی، اُس طرف بے کسی
درمیاں کفر ہے منصفی کیلئے
برہمن کیلئے ہر ستم راس ہے
ظلم سب ہیں روا شیخ جی کیلئے
سب درندوں کی اک انجمن بن گئی
کوئی محفل نہیں آدمی کیلئے
مُفلسی الوداع کہہ کے چھوڑی تھی کل
آج رُسوائی ہے رُخصتی کیلئے
کیوں دھواں ہی دُتواں ہے عزیز ہر طرف
دل جلے یا مکاں روشنی کیلئے



کیوں سفر میں ہی رہا کرتے ہیں اکثر قافلے
 کیا سفر ہی ان کی منزل ہے کہ رُکتے ہی نہیں
 ذہن پر اندھے سفر کا جیسے کچھ صدمہ نہ ہو
 آرہے ہیں کر کے سر دیکھو تو کتنی منزلیں
 چاہے کتنا ہی فریبی ہو سمندر کا سکوت
 سر پہ چڑھتی دھوپ ہے ہر سوسلکا ریگزار
 چھاؤں دیکر دھوپ سہنے میں کئی اشجار کی
 کیا خبر، کب ختم ہوگا اس سفر کا سلسلہ
 روزِ اوّل سے سفر میں ہیں برابر قافلے
 صُبح کے آثار ہوں یا شام کا عالم عزیز
 خود ہی اڑ جاتی ہیں سب چیزیاں بنا کر قافلے



پھر سفر پر جارہے ہیں ہمسفر کو چھوڑ کر
 منزل مقصود آگے ہے کہ پیچھے رہ گئی
 بڑھ رہے ہیں جانبِ صحرا ہوا کے دوش پر
 آشیانہ ڈھونڈتے ہیں ہم دیارِ غیر میں
 عرش تک اسکی رسائی ہو گئی تو کیا ہوا
 غم سے بوجھل ذہن میں کچھ کر گزرنے کا جنوں
 حاجتیں در کھول دیتی ہیں، مگر وقتِ سفر
 جا ملے آخرِ غبارِ منزلِ ناکام سے

آبر باراں ڈھونڈنے نکلے ہو صحرا میں عزیز

گھر کے سبزہ زار پہ برق و شرر کو چھوڑ کر !



سن کے جس کو دل چل جائے وہ نغمہ بھیج دو
 جو تمہارے ساتھ گزرے تھے جنونِ عشق میں
 پھر بہارِ زندگی کا عکس آئیگا نظر
 کروٹیں لیتی ہیں ہر دم جو تمہاری یاد میں
 چاہئے گردِ داد تم کو حسن کے ہر شعر پر
 وہ جسے حاجت نہیں ہے کچھ شعاعِ شمس کی
 پھر نئے طوفاں سینے چھا رہی ہیں بدلیاں
 تم کو زحمت بھی نہ ہوگی ہم بھی خوش ہو جائینگے

اس اُداسی میں خوشی کا ایک لمحہ بھیج دو
 ہو سکے تو پھر وہ دن اور وہ زمانہ بھیج دو
 ”آئینہ خالی پڑا ہے اپنا چہرہ بھیج دو“
 اُن اُمٹکوں کیلئے کوئی سہارا بھیج دو
 اُس شگفتہ رو غزل کا ہم کو تحفہ بھیج دو
 اُس دکتے رخ کی کرنوں کا اُجالا بھیج دو
 اپنے گیسو، اپنے آنچل کا سہارا بھیج دو
 کچھ نہیں تو، کم سے کم سادہ لفافہ بھیج دو

تم تو آنے سے رہے پر خط کی صورت میں عزیز
 چند لفظوں میں سہی اپنا سراپا بھیج دو



کبھی خیرات کو لوٹا نہ دینا
 خبر ہو ہاتھ کو ایسا نہ دینا
 مری تصویر ہے، رکھ اس کو دل میں
 دعا تعبیر نے دیدی تو کیا غم
 جو کہنا ہے اُسے کہدوں گا سب کچھ
 ہمارا خوں بہت ارزاں ہے، پی لو
 نہا کر دھوپ میں آئے ہوئے ہیں
 میں آئینہ ہوں، اپنے عیب دیکھو

سچی کے ہاتھ میں کاسہ نہ دینا
 کہ اس دینے سے ہے اچھا نہ دینا
 اسے دیوار پر لٹکا نہ دینا
 مجھے آئے خواب تو دھوکا نہ دینا
 مگر تم بچ میں شوشہ نہ دینا
 ہمیں پانی سہی، مہنگا نہ دینا
 کہیں اس چھاؤں میں سلگا نہ دینا
 مرے ہاتھوں میں آئینہ نہ دینا

عزیز اب تو سینے کی گھڑی ہے
 یوں اپنے آپ کو بکھرا نہ دینا



یارب جہاں میں کیسا طوفاں اُٹھا ہو ہے
 حسرت ہے زندگی کی نہ موت کی تمنا
 ہر آدمی کا دل کیوں پتھر بنا ہوا ہے
 دل ہے مگر کسی کی اب آرزو نہیں ہے
 گھر میں چراغ تو ہے لیکن بجھا ہوا ہے
 ہر شخص اس جہاں کا تنہا کھڑا ہوا ہے
 وہ معترض ہے جس کا پیالہ بھرا ہوا ہے
 خاموش ہیں وہ جن کے خالی ہیں جام لیکن
 افکارِ زندگی سے بوجھل ہے ذہن پھر بھی
 دل ایسی بے کلی میں نغمہ سرا ہوا ہے
 رسمیں نباہنے کو رشتے بنالیئے ہیں
 ورنہ کسی کا کوئی کب آشنا ہوا ہے
 مانا کہ خوب تر ہے گلزارِ زیست لیکن
 آنکھوں پہ آج اپنی پردہ پڑا ہوا ہے
 کل تک عزیز جس کا پیشہ ہی رہ زنی تھا
 قسمت سے وہ ہمارا اب رہ نما ہوا ہے



غمِ زندگی سے کسینے، ہم کیوں نہ جی لگائیں
 مری کاوشوں کے صدقے مرا بن گیا نشیمن
 سرِ شام جل اُٹھے ہیں، یہ چراغ کیوں بُجھائیں
 کوئی بجلیوں سے کھدے مجھے پھر نہ آزمائیں
 ادھر آئے بیقراری کہ میں لوں تری بلائیں
 نہ یوں روشنی دکھا کر مجھے دیجئے صدائیں
 مرا ضبط دے رہا ہے تجھے رات دن دعائیں
 کسے حالی دل سنائیں، کسے زخمِ دل دکھائیں
 میں بہت تھکا ہوا ہوں مراد نہ کھٹکھٹائیں
 غمِ زندگی سے کسینے، ہم کیوں نہ جی لگائیں
 مری کاوشوں کے صدقے مرا بن گیا نشیمن
 مجھے کب یہ آرزو تھی کہ ہو دور مجھ سے تو بھی
 میں چلا ہوں سوئے ظلمت، مجھے تیرگی سے اُلفت
 وہی بے دلی کے شکوے، وہی بے رخی کی باتیں
 کبھی یار دوستوں کے ہیں مزاج بدلے بدلے
 وہ تمام بچی یادیں مرے گھر سے لوٹ جائیں

اے عزیز اُن سے کھدو جو مجھے پرکھ رہے ہیں
 کبھی اپنا جائزہ لیں کبھی خود کو آزمائیں



یاد کبھی جب آجاتی ہے بھولے ہوئے افسانوں کی
 دل میں آنکھیں کھل جاتی ہیں سوئے ہوئے ارمانوں کی
 پیار کے بدلے رسوائی دی وصل کے بدلے تنہائی
 حیراں ہوں میں کیسے چکاؤں قیمت ان احسانوں کی
 جل جل کے مر جانے پر تو سب نے ہی افسوس کیا
 پر نہ کسی نے خاک اٹھائی بڑھ کر ان پروانوں کی
 محفل میں غیروں کی خاطر جب تو پہروں جلتی ہے
 خاک بکھرنے لگتی ہے اُئے شمع ترے پروانوں کی
 رند ہیں سارے تشنہ تشنہ، ساقی بھی کچھ بیدل سا
 دیواروں سے سر ٹکرائے کیوں نہ صدا پیانوں کی
 دن کو سنگھ کی کھوج میں رہنا، رات بتانا آنکھوں میں
 چین کی خاطر چین گنونا، عادت ہے دیوانوں کی
 دیمک جیسے چاٹ رہی ہے فکر جہاں لمحہ لمحہ
 جب سے فراوانی ہے گھر میں جینے کے سامانوں کی
 وقت کے طوفانی دھاروں کو یار و کب تک روؤ گے
 مال گیا تو جانے بھی دو خیر مناؤ جانوں کی
 جھوم کے قسمت ناچ رہی ہے آج سیاستدانوں کی
 اب دنیا میں خیر نہیں ہے ہم جیسے نادانوں کی
 وقت نے ایسا جالا پھینکا اپنا ہی خود ہوش نہیں
 ایسے میں تکرار ہے بے جا اپنوں کی بیگانوں کی
 کیسی بھلائی، کون ہے محسن، سب کہنے کی باتیں ہیں
 انسانوں سے ہی دو بھر ہے یہ دنیا انسانوں کی
 یوں تو شہر کے سارے چہرے ہیں جانے پہچانے سے
 کبھی کبھی یوں لگتا ہے یہ بستی ہے انجانوں کی

کتنی صدیوں سے پتی ہے روزِ لہو انسانوں کا

پھر بھی عزیز اپنی یہ دنیا بھوکی ہے انسانوں کی



مری چاہتوں کی دنیا تری نفرتوں کے آگے
تری ہیج محفلیں ہیں مری خلوتوں کے آگے

کسی غم کا کچھ اثر ہے ، نہ خوشی پہ یہ نظر ہے
وہ مقام آگیا ہے مری حسرتوں کے آگے

کوی زندگی کا طالب ، کوئی زندگی سے بیدل
کوئی راحتوں کے پیچھے ، کوئی آفتوں کے آگے

گل تر سے کوئی کہدے ، پس دل نشیں تبسم
وہ خزاں کھڑی ہوئی ہے تری نکہوں کے آگے

نہ سہم شبِ سیاہ سے ، ذرا دیکھ تو افق پر
ہے جہانِ نور پنہاں ، انہیں ظلموں کے آگے

تجھے ناز کیوں فلک ہے ، بھلا اپنی وسعتوں پر
کئی اور آسماں ہیں تری رفعتوں کے آگے

اے عزیزِ ان سے ہٹ کر کئی اور راستے ہیں
کئی اور منزلیں ہیں تری منزلوں کے آگے

۱۹۸۴ء حیدرآباد میں ہوئے فرقہ وارانہ فسادات پر۔۔۔ ایک تاثر

اُجالے جس جگہ ملزم اندھیرے مدعی ٹھہرے
ہمارے ہی لئے ہیں بند اپنے گھر کے دروازے
شہر کے ہر گلی کوچے میں قاتل چھپ کے بیٹھے ہیں
ٹھہر سکتا ہے صدیوں تک سمندر ایک حالت میں
کسی فتنے کا اندیشہ وہیں محسوس ہوتا ہے
وفا کر کے بھی ہم تو بے وفا ہیں سب کی نظروں میں
توقع کیا رہے باقی وہاں اب سرفرازی کی
یہ دنیا کارزارِ زندگی اور موت ہے، اس میں
ان اکھڑی اکھڑی سانسوں پر ذرا قابو تو پالیں گے
سہکتے ہیں تو یوں ہنتے ہیں اربابِ ستم ہم پر
وہاں تاریکیوں کا نام کیوں نہ روشنی ٹھہرے
یوں اپنے در پہ ٹھہرے ہیں کہ جیسے اجنبی ٹھہرے
بچانے زندگی جا کر کوئی اب کس گلی ٹھہرے
مگر ممکن نہیں بہتا ہوا پانی کبھی ٹھہرے
جہاں پر آدمی کے ساتھ کوئی آدمی ٹھہرے
تمھاری بے وفائی بھی ادائے دلبری ٹھہرے!
خمیدہ سرد لاشوں پر جہاں شرمندگی ٹھہرے
تمنا سرفروشی کی ہے جس کو بس وہی ٹھہرے
اگر یہ وقت کی رفتارِ ظالم دو گھڑی ٹھہرے
کسی کے دل کی بے چینی بھی جیسے دل لگی ٹھہرے

عزیز ان سونی گلیوں میں بہاریں لوٹ آئیں گی

مگر اُس دن کی خاطر کون ساری زندگی ٹھہرے



سہا سہا سا جہانِ رنگ و بو ہے اور ہوا
 زندگی کا شور ہے یا ہا و ہُو ہے اور ہوا
 کیسا موسم آج در آیا ہے باغِ زیست میں
 شاخِ گل پہ پتہ پتہ دُردو ہے اور ہوا
 جس سے سائے کی توقع تھی وہی آنگن کا پیڑ
 گھر کی چھت پر اک بلائے خُبرو ہے اور ہوا
 بکھرے بکھرے سے یہ تنکے، یہ غبارِ خار و خس
 سر چھپانے کی ہماری جستجو ہے اور ہوا
 دھوپ کی شدت سے ہے جس کا بدن تڑخا ہوا
 ابرِ باراں اُس زمیں کے روبرو ہے اور ہوا
 اس پہ قابو ہے نہ کوئی اُس پہ بس اے زندگی
 آج تک الجھا ہوا ہم سے عدو ہے اور ہوا
 گرچکا اشکِ ندامت کب کا تیری آنکھ سے
 اب خود اپنی آگ کے شعلوں میں تو ہے اور ہوا
 اس کی منزل ٹوکری ہے، یا رسالے کا ورق
 میز پر میرے قلم کی آبرو ہے اور ہوا
 اے شبِ تاریک کوئی راستہ تو ہی بتا
 ٹھٹھاتا اک چراغِ آرزو ہے اور ہوا
 بادبانوں کی طنابیں کھینچتے رہیے عزیز
 اب سمندر ہی سمندر چار سو ہے اور ہوا



ساری رودادِ وفا ساری حکایت پوچھو
 اُس نے کس بات پہ دل توڑ دیا مت پوچھو
 آج لیتے ہیں مکس چین کی نیندیں جس میں
 کس نے رکھی تھی وہ بنیادِ عمارت پوچھو
 خار سے ، غنچہ و گل سے ، نگہ لگچیں سے
 سبق ملا ہے ہمیں ، ہم سے حقیقت پوچھو
 اپنی اُلفت سے جنہیں دی تھی حلاوت ہم نے
 کیوں اُنہیں ہونٹوں پہ ہے تلخ شکایت پوچھو
 کس نے پلکوں سے چنا ہے خس و خاشاک یہاں
 کس نے گلزار کیا دشتِ محبت پوچھو
 لوگ کرتے ہیں بہت اُنکی وفا کے چرچے
 ہم ہیں رُسوائے جہاں کس کی بدولت پوچھو
 کس نے مجبور کیا ترکِ تعلق کے لینے
 کون ہے مجرمِ دستورِ محبت پوچھو
 کل جو دیتے تھے میرے حق میں گواہی اپنی
 آج کیوں غیر کی کرتے ہیں وکالت پوچھو
 فیصلہ صرف حقائق پہ جہاں ہوتا ہے
 کون سے شہر میں ہے ایسی عدالت پوچھو
 روز سُنتے ہیں کہ اک روز قیامت ہوگی
 کیا نہیں ہوتی یہاں روزِ قیامت پوچھو
 جاں بہ لب ہوں میں عزیز اب تو یہ نفرت چھوڑو
 آج تو پیار سے بیمار کی حالت پوچھو



جب سے ہوئی ہے زحمت تکرار گفتگو
 بیٹھو غریب خانے میں پھر چین سے کہو
 کل تک یہی تھی ذیبت دیوان خاص، مام
 پتوں کو درغلا رہی ہے سازش ہوا
 کہتے ہیں جس کو خیر اسی شے کا نام ہے
 جس طرح گفتگو سے بہتی ہے طبیعت
 جب سے کہا ہے اُس نے کہ میں بے قصور ہوں
 بھولے ہوئے ہیں صاحب گفتار گفتگو
 ہم اور تم و یوں پس دیوار گفتگو؟
 اب ہو گئی ہے رونق بازار گفتگو
 یا پیڑ کر رہے ہیں پراسرار گفتگو؟
 لیکن بوجہ شر ہے گراں بار گفتگو
 کرتی ہے اسی طرح سے بیزار گفتگو
 میں ہوں، میرا ضمیر دھواں دھار گفتگو
 آئینہ دار جذبہ ہستی ہے دل عزیز
 کرتا ہے ہم سے روز کئی بار گفتگو



چاندنی سے چوٹیں گے دھوپ میں نہائیں گے
 ملگجی چراغوں پر اوس پڑ گئی تو کیا
 کچھ مفاد ہوتے ہیں، ہر خصوص کے پیچھے
 ان سے دُور مت رہنا، ان کو چھو نہیں لینا
 بے ثبات خوابوں کی، بے ثمر ہے تعبیریں
 رہ نما و رہزن ہیں ایک جان دو قالب
 نعمتیں یہ دنیا کی اک سراب جیسی ہیں
 یہ بھی اپنے سائے ہیں اپنی خود کھائیں گے
 دُھندلے دُھندلے سایوں سے شہر جگمائیں گے
 ورنہ دستکیں دنیا لوگ بھول جائیں گے
 یہ ہیں کالج کے رشتے ٹوٹ پھوٹ جائیں گے
 ہم ضمیمہ کو ایسی نیند سے جگائیں گے
 ان کے بچ دیواریں کس طرح اٹھائیں گے؟
 سبز باغ کے یہ پھل کس کے ہاتھ میں گے

دیکھنا نہ چہورے گی یہ ہوا عزیز اُن کو

جو لچکتی نہی پر آشیاں بنائیں گے



رشتے ، ناطے کیا ہیں اک آزار ہے یہ
 مٹی کے برتن کا کاروبار ہے یہ
 بربت بھی ہیں اس میں گہرے دلدل بھی
 سنبل کے رکھنا پاؤں میاں سنار ہے یہ
 اپنے ہر رستے پر دنیا حائل ہے
 ہر منزل سے پہلے اک دیوار ہے یہ
 ذہن میں ہے امروز نہ آنکھوں میں فردا
 سکتہ ہے یا گرتا ہوا معیار ہے یہ
 آپ کے سر کی زینت ہے کس کی پیزار
 قدموں میں جو ہے کس کی دستار ہے
 پلک جھپکتے ہی جو ہم سے دور ہوا
 وہ اک پل تھا ، اُس پل کی رفتار ہے یہ
 ہم ہیں سوز تو ساز ہے یہ اپنی ہستی
 ہم پائل ہیں ، پائل کی جھنکار ہے یہ
 اس کے فن کے پروانے ہیں محلوں میں
 کٹیا اس کا مسکن ہے فنکار ہے یہ
 کھیل نہیں ہے یہ محنت ، یہ مزدوری
 جس پر روٹی پکتی ہے وہ نار ہے یہ
 سمجھوتا حالات سے ہے اک کمزوری
 جیت نہ کہنا اس کو عزیز کہ ہار ہے یہ



چیتنے در ، خامشی دیوار کی
 لو حقیقت کھل گئی دیوار کی
 کہہ رہے ہیں نرم بستر چھوڑ دے
 چڑھتا سورج اور گھڑی دیوار کی
 اپنے سائے میں جگہ دیں یا نہ دیں
 دھوپ کی مرضی ، خوشی دیوار کی
 گھر کی باتیں کہہ گیا گھر کا ستوں
 سن پکا تھا ان سنی دیوار کی
 گھر تو سارا بن چکا ہے خیر سے
 رہ گئی ہے بس کمی دیوار کی
 دو دلوں کے فاصلے کا ذکر تھا
 بات یہ اچھی کہی دیوار کی
 کیا کہیں آندھی کے پھر آثار ہیں
 اہمیت کیوں بڑھ گئی دیوار کی ؟
 ایک دروازہ ضروری تھا جہاں
 اُس جگہ ، اُس نے کھڑی دیوار کی !
 بوجھ گھر کا کس کے سر جائے گا اب
 پوچھتی ہے یہ نبی دیوار کی
 نیل بوٹے دھوپ میں . پھر آگئے
 دو گھڑی کی چھاؤں تھی دیوار کی
 پوچھتے ہیں دیکھ کر ملبہ سبھی
 قتل تھا یا خود کشی دیوار کی
 غیریت کی بات ہی کیا ہے عزیز
 جنگ ہے یہ آپسی دیوار کی



اہل دل ، اہل نظر ، اہل صفا بیٹھے ہیں آج آربابِ سخن ایک جگہ بیٹھے ہیں
 ذکر چھیڑو تو فقط آج وفا کا پیرو آج محفل میں سبھی اہل وفا بیٹھے ہیں
 پھر بھڑکتا ہے دیا تندہ بوؤں کے سبب دو گھڑی دشت میں خیمہ جو لگا بیٹھے ہیں
 اُن بگولوں سے بھی پوچھو کہ تھکاوٹ کیا ہے دوشِ ساحل پہ جو ستانے ذرا بیٹھے ہیں
 گھر کو آتے تھے جو اظہارِ تاسف کیلئے آگ بستی میں وہی لوگ آ بیٹھے ہیں
 طہر کا حق نہیں برسات پر اُن لوگوں کو اپنا گھر اپنے ہی ہاتھوں سے جوڑنا بیٹھے ہیں
 کس کو ہوتی ہے بھلا تہمت و رسوائی عزیز
 ہم ہی ناداں ہیں جو احباب میں آ بیٹھے ہیں



یہ حقیقت ہی نہیں ہے ایک افسانہ بھی ہے دشمنی جن سے ہوئی ہے اُن سے یار نہ بھی ہے
 بے وفائی اُن کا شہرہ ہی سہی لیکن مجھے اُنکو آدابِ وفا کیا ہیں ، یہ سمجھنا بھی ہے
 یہ چراغوں کو بجھایا ہی نہیں کرتی فقط اس ہوا کا کام تو شعلوں کو بھڑکانا بھی ہے
 شاخِ گل پر رہنے والا یہ خبر بھی ہے تمہیں اس گمستاں کے کسی گوشے میں ویرانہ بھی ہے
 جس نظر سے شمع کا جلنا نہ دیکھا جا سکا اُس نظر میں کچھ مقامِ خاک پر دانہ بھی ہے؟
 سب میں رو کر بھی الگ رہنے کی عادت پر مجھے لوگ کہتے ہیں کہ دانا بھی ہے ، دیوانہ بھی ہے

فصلِ گل میں کھل کے اترتے ہیں جو نیچے چڑھتے

اُنکو کیا معلوم کہ اک روز مَر جھانا بھی ہے



کانٹے نہ بچھا رکھنا ، خنجر نہ چھپا رکھنا
 دنیا بھی کہیں تم کو قاتل نہ سمجھ بیٹھے
 آہوں کی کہیں دل سے مد بھیڑ نہ ہو جائے
 پانی نہ اگر بر سے ساون کے مہینے میں
 کلیوں گے چنچنے سے خوشبو تو مہکتی ہے
 شاخوں کی پناہوں میں بیٹھے میں کئی تپیں
 راتوں کی سیاہی میں رستہ نہ جہاں سوچھے
 دنیا نے تری آخر انجام کو پہنچایا
 فرقت میں بھی جب دل میں رہتا ہے تو پھر کہیں

بھیار تو اوروں کی ، تقلید نہیں کرتا
 پہچان عزیز اپنی دنیا سے جدا رکھنا



چھوٹی سی اس زمیں پہ کشادہ مکان رکھ
 دیوار نام کی نہ ہو کوئی بھی شے جہاں
 منہ میں زبان رکھ کے بھی جو بے زبان ہیں
 مجبوریاں یہ کہتی ہیں سو جا تو بھوکے پیٹ
 زخمی طیور اپنے سبھی زخم دھو سکیں
 اپنی سطح سے سر ترا اونچا نہ اٹھ سکے

تیری سرشت میں نہ ہو حرفِ جفا عزیز
 پیشِ نظر خلوص کی اک شمعِ دان رکھ



بظاہر بے زباں ہیں سب کے سب پر بات کرتے ہیں
 سلیقہ دیکھنے کا ہو تو منظر بات کرتے ہیں
 سحر دم جب پرندے چھپاتے ہیں فضاؤں میں
 تو یوں محسوس ہوتا ہے سخور بات کرتے ہیں
 وہ میرے سامنے تصویر کی مانند ہیں خاموش
 وہی جب یاد آتے ہیں تو کھل کر بات کرتے ہیں
 ستم حد سے سوا ہو تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
 شکن ماتھے کی اکساتی ہے تیور بات کرتے ہیں
 لکیروں کو زبانِ حال دیدی ہے مَصَوْر نے
 ذرا دیکھے کوئی پیکر سے پیکر بات کرتے ہیں
 کسی پتھر کے آگے کوئی پتھر کچھ نہیں کہتا
 کہیں شیشہ دکھائی دے تو پتھر بات کرتے ہیں
 یہ نظم میکدہ ہے یاں کوئی جنبش نہیں کرتا
 صراحی حکم دیتی ہے تو ساغر بات کرتے ہیں
 سمندر سے سفینے حالِ دل اپنا نہیں کہتے
 مگر ساحل سے سرگوشی میں اکثر بات کرتے ہیں
 سفینہ جب کسی گرداب کے نرغے میں آتا ہے
 قضاء چپ چاپ سنتی ہے مقدر بات کرتے ہیں
 عزیز اشکوں کی اک تحریر سی بنتی ہے تکیے پر
 دلِ ناکام سے جب دیدہ تر بات کرتے ہیں



دل کو ہے ملا کچھ تو سکوں جب سے لگی چُپ
 کہنے پہ نہ اگسا مجھے رہنے دے ابھی چُپ
 گفتار کی عادت نے تو رکھا نہ کہیں کا
 بے شک یہ بھلی بات ہے کہ ”سب سے بھلی چُپ“
 گھٹنے بھی نہ پائے تھے عیادت کو مرے ہونٹ
 کہنے لگی مجھ سے ترے آنکھوں کی نمی ، چُپ
 پروانے کی چیخوں سے تو محفل میں تھا کھرام
 شب بھر تو جلی شمع مگر ، پھر بھی رہی چُپ
 تھک ہار کے چپ سادھ لیں بیتاب نگاہیں
 لیکن یہ تیرے حسن کی تصویر نہ تھی چپ
 کیا سانپ گیا سونگھ مرے شہر وفا کو
 بازار ہیں خاموش تو ہر ایک گلی چُپ
 وہ ضبط کہاں ہے جو سنے دھڑکنیں دل کی
 وہ نطق کہاں ہے جو کہے دل کی لگی چُپ
 سمجھو کہ ہوا ختم وہیں سارا فساد
 ہو جائے جہاں دل کی زباں ایک گھڑی چُپ
 کھیتوں پہ برسنے سے نہ تھا کوئی افادہ
 شائد یہ سمجھ کر ہوئی ساون کی جھڑی چُپ
 چلتی ہے عزیز کب یہ ہوا ایک ہی رخ پر
 دنیا کا یہی حال ہے ، میری نہ تری چُپ



یوں اپنی راستی پر اُترا ہوا ہے شیشہ
 یہ کیسی دھوپ نکلی دامن میں آگ لیکر
 انسانیت کے ٹکڑے بکھرے پڑے ہوئے ہیں
 حیران سی نگاہیں ہر اک سے پوچھتی ہیں
 دیوار پر تھا جب تک محفوظ تھا وہ لیکن
 اتری ہوئی ہے صورت اُنکی تو اس لیے ہے
 دھوکے کی ساری چیزیں شوکیں میں بھی ہیں
 اب اپنی شخصیت بھی شیشوں میں بٹ گئی ہے
 اپنی انا کی خاطر اب اس کو توڑ دیجیے
 دے کر حیا کا پارہ بھر دیں جان اس میں

جو چیز سامنے ہو دکھلا چکا ہے شیشہ
 کھلا گئے ہیں چہرے دھندلا گیا ہے شیشہ
 اخلاق گر گئے، یا نیچے گرا ہے شیشہ
 دیوار سے لپٹ کر کیوں رو رہا ہے شیشہ
 ہاتھوں میں جب سے آیا سہا جاتا ہے شیشہ
 اُن کی دلیل ساری مجھٹل گئی ہے شیشہ
 کھوئی ہے چیز اتنی جتنا کھرا ہے شیشہ
 شیشے کے سامنے اک رکھا ہوا ہے شیشہ
 اپنی انا کا لوہا مٹا چکا ہے شیشہ
 اُس شیشہ گر بنے جیسا چاہا بنا ہے شیشہ

حیرت مزید ہے تو اس بات کی ہے حیرت

تاریکیوں میں کسے دیکھا گیا ہے شیشہ



چراغوں کے سلگنے سے اندھیرا کم نہیں ہوتا
نکلتا شب کو بھی سورج تو کوئی غم نہیں ہوتا

تمہارے ساتھ ہی رونق بھی رخصت ہوئی سر سے
اگر اک تم نہیں جاتے تو یہ عالم نہیں ہوتا

بن تو ہموؤا فح و نصرت کی علامت ہے
شست فاش میں تو ہاتھ میں پرچم نہیں ہوتا !

اتا کو توڑ دیتی ہے پشیمانی بھی کیا شے ہے
مگر یہ سر بھی ہے کیا چیز ظالم خم نہیں ہوتا ؟

نمایاں عیب ہیں اپنے مگر عبرت نہیں ہم کو
یہی اک بات ہے جس کا کہیں ماتم نہیں ہوتا !

یہ مانا جذب کی فطرت سے عاری ہے ، حقیقت ہے
مگر یہ بھی نہیں ہے سچ کہ پتھر غم نہیں ہوتا !

سفر بے کیف ہو جاتا عزیز ہم سرفروشوں کا
سمندر کے تہوج میں جو زیر و بم نہیں ہوتا



خاکِ پروانہ کی طرح بانگین کے ساتھ ہوں
میں بکھر کر بھی تمھاری انجمن کے ساتھ ہوں

رات بھر جلتا رہا ہوں میں پراغوں کی طرح
خوشیاں پھر صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہوں

اس قفس کی ساری دیواریں محافظ بن گئیں
میں سلامت ہوں بھی تو سر پر کفن کے ساتھ ہوں

ہر بلا اطراف ہے تو کیا کہ ہے سب کا علاج
حادثوں کے درمیاں بھی کس جتن کے ساتھ ہوں

بیدخل کرنا نہ ویرانے سے بھی اہل چمن
گو میں ویرانے میں ہوں لیکن چمن کے ساتھ ہوں

یہ بھی میری زندگی کا اک حصہ بن گئی
ہے گھٹن ہمراہ میرے، میں گھٹن کے ساتھ ہوں

وقت نے پردہ دیدیئے ہیں چھین کر بیساکھیاں
زندگی کی دوڑ میں اب میں ہرن کے ساتھ ہوں

آنکھ کہتی ہے چٹانوں میں بسیرا ہے عزیز
دل یہ کہتا ہے کہ میں ایک کوہ کن کے ساتھ ہوں



نہ کچھ خوشی کی خوشی ہوئی ہے نہ کوئی غم کا اثر ہوا ہے
 نہ اُنکی باتیں ، نہ اپنا دُکھڑا ، بس اک خموشی کا سلسلہ ہے
 یہ میری سانسیں تمھاری سانسوں میں غرق ہو کر بھی کہہ رہی ہیں
 کہ دو دھڑکتے ہوئے دلوں میں ابھی تو صدیوں کا فاصلہ ہے
 مرے ہی گھر کے در و در پہ عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں
 میں اُن کی نظروں میں اجنبی ہوں ، مرا لہو جن میں بہہ رہا ہے
 سکوں کی خاطر جدھر سے گذرا ، سلگتی خوشیوں کی آج آئی
 گلوں کے سینے جلے ہوئے ہیں ، چمن کا چہرہ مجھا بجھا ہے
 نہ کوئی طالب ہے یاں خوشی کا ، نہ کوئی محتاج زندگی کا
 مرے شہر کا ہر ایک شہری یوں وقت اپنا گذارتا ہے
 نہ دن کا مقصد ، نہ شب کا معنی ، نہ ذکر ماضی ، نہ فکر فردا
 جدھر ہوائیں بہا رہی ہیں ، اُدھر یہ سیلاب بہہ رہا ہے
 ستم ہے میری اُداسیاں بھی نظر میں سب کی کھٹک رہی ہیں
 کہ جیسے یہ مال تھا کسی کا اور اُس کو میں نے پڑالیا ہے
 جہاں سکوں کے تھے بیج بوئے ، وہاں پہ دُکھ کی فصل کھڑی ہے
 اسے تعجب سے تم نہ دیکھو نئی رُتوں کا یہ معجزہ ہے
 عجب تری انجمن ہے ساقی ، کہ دیکھ کر انتشار میں نے
 جو ذکر امن و امان چھیڑا تو ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہے
 جو سر پہ ہے اُس غموں کی چھت کو ستون بن کر سنبھالنا تھا
 عزیز میرے دل حزیں نے یہ بوجھ ہنس کر اُٹھالیا ہے



دن دہائے آرزوئے زندگی کرتے ہوئے
آج پھر پڑے گئے ہیں خود کشی کرتے ہوئے

کب اُجانوں میں بدلتے ہیں اندھیرے رات کے
تھک گئے ہم رات ساری روشنی کرتے ہوئے

فیصلہ ہوگا مرا شاید مرے مرنے کے بعد
زندگی تو کٹ رہی ہے پیروی کرتے ہوئے

حد سے آگے بڑھ گیا ہے بادبانوں کا فساد
کشتیاں بھی تھک چکی ہیں تالشی کرتے ہوئے

رنگ و روغن، رعب و رعنائی گنوا بیٹھے ہیں ہم
کا کل ہستی تری صورت گری کرتے ہوئے

آپ اپنا خون پینا ضبط کی معراج ہے
آدمی بن جائے یوں میکشی کرتے ہوئے

لاکھ سرگوشی سبھی، دیوار پھر دیوار ہے
راز کھدے گی ہوا سے دوستی کرتے ہوئے

دشت سارا جل رہا ہے گم رہی کی آگ میں
پھر ہوائیں گھومتی ہیں رہبری کرتے ہوئے

اجنبی سی ہوئیں گلیاں عزیز اُس شہر کی
عمر جس میں کٹ گئی سوداگری کرتے ہوئے



میں تمھارا ہوں یہ تم نے کیا کہا کوئی نہیں !
اس سے بڑھ کر زندگی کا حادثہ کوئی نہیں !

میں قریب آتا گیا جو دُور تم ہوتے گئے
اب بھی مجھ میں اور تم میں فاصلہ کوئی نہیں

میں مسافر ہوں وہی جس کی نظر کے سامنے
منزلیں ہی منزلیں ہیں ، راستہ کوئی نہیں

اس قدر پابندِ قانونِ حیاتِ نو ہیں ہم
اب ہماری زندگی کا قاعدہ کوئی نہیں

آج دنیا لگ رہی ہے شب کا سناٹا مجھے
سارا عالم نیند میں ہے جاگتا کوئی نہیں

احترامِ جام و مینا ہے نہ ساقی سے غرض
میکدے میں آج رند باوفا کوئی نہیں

تیری صورت، تیرا جلوہ، تیری آنکھیں، تیری دید
آئینے میں تو ہی تو ہے دوسرا کوئی نہیں

زیست کا ہر ایک پہلو اک پہیلی ہے عزیز
یہ وہ نکتہ ہے کہ جس پر سوچتا کوئی نہیں



ہم کو دیوانہ نہ سمجھو ہم ہیں موجی آدمی
 سیدھے سادھے ہیں مگر ہیں انقلابی آدمی
 دل ہمارے مختلف ہیں شخصیت بھی مختلف
 تم سیاسی آدمی ہو ہم سماجی آدمی
 آدمیت کے تقاضوں سے نہیں جو بہرہ ور
 ناز ہے انکو کہ وہ ہیں خاندانی آدمی
 زندگی جس کی ریاکاری ، عبادت مکر و فن
 ایسے زائد سے تو بہتر ہے شرابی آدمی
 نفرتوں کا بیج بونے سے اگا ہے جو یہاں
 کر رہا ہے اُس شجر کی آبیاری آدمی
 آسمانی آفتوں کو کوستا ہے کس لیے
 اس زمیں پر جب مچاتا ہے تباہی آدمی
 دل میں احساس بھلائی ہے درندوں کیلئے
 پر نہ چاہے آدمی کی خیر خواہی آدمی
 امن کے پیغمبرو سر سے کفن باندھو اٹھو
 سر اٹھاتے ہیں جہاں میں پھر فساد آدمی
 لاکھ سمجھاؤ سبق انسانیت کا اے عزیز
 کب اسے خاطر میں لاتا ہے سیاسی آدمی



یوں نہ جذبات کے دھارے میں مچل کر تیرو
موج در موج تلاطم ہے ، سنبھل کر تیرو

تم پہ جھپٹے جو کسی وقت ڈبونے کیلئے
پنجرہ موج مخالف کو کچل کر تیرو

ہے بظاہر تو سمندر کی طبیعت میں سکوت
اس تغافل میں نہ قابو سے نکل کر تیرو

چھیڑ کر وہ جو سفینوں کو گذر جاتی ہیں
رُخ ذرا ایسی ہواؤں سے بدل کر تیرو

چشم میگوں کی لطافت تو ہے شبنم سے لطیف
اس حسیں جھیل کے پانی میں سنبھل کر تیرو

آنکھ لگ جائے نہ موجوں کے بچھونے پہ کہیں
بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو مسل کر تیرو

آگ پھیلی ہوئی ہے سارے سمندر میں عزیز
جلتی موجوں کا تقاضہ ہے کہ جل کر تیرو



سوچتے ہیں حل مسائل کا تو تھک جاتے ہیں لوگ
اپنا سایہ ڈھونڈنے کو دور تک جاتے ہیں لوگ

خود اُلجھ جاتے ہیں اکثر بے بسی کے جال میں
جب کوئی تنقید کرتا ہے : پتہ جاتے ہیں لوگ

جب ذرا خوش ہوں تو جھوٹے ڈالتے ہیں شاخ پر
اور صدمہ ہو تو شاخوں پر لٹک جاتے ہیں لوگ

لطف آتا ہے بھٹکنے میں جو دورانِ سفر
سیدھا رستہ چلتے چلتے بھی بھٹک جاتے ہیں لوگ

ساہباں ہیں ہم تمھارے بھے ، کہتے ہیں سب
جب ذرا بارش ہو چکے : تنک جاتے ہیں لوگ

ان کے خیر و شر میں اکثر گم نہیں سکتے تمیز
کچھ نمک اس طرح زخموں پر چھڑک جاتے ہیں لوگ

ہوں اگر بیکار تو چھتے ہیں سب کی آنکھ میں
کام کرتے ہیں تو نظروں میں کھٹک جاتے ہیں لوگ

ہر کسی کو اپنا رہبر مان لینے سے عزیز
منزوں تک آکے بھی اکثر بھٹک جاتے ہیں لوگ

مولانا محمد بن عرب خلیل شکیب صاحب بعارضۃ کینسر جدہ سے پاکستان لوٹ رہے تھے
وداعی تقریب میں منظوم نذرانہ عقیدت (۱۹۸۵ء)

فرقت کے پھر یہ شام و سحر دے گیا کوئی
جتنی حقیقتیں تھیں سبھی ساتھ لے گیا
اب تک وہیں پہ ٹھہری ہوئی ہے مری نظر
وہ یوں گیا کہ مڑ کے بھی دیکھنا نہ ایک بار
رواق بھی گھر کی ہو گئی رخصت اسی کے ساتھ
مُصنّف بھی جانتا تھا کہ مجرم تھا کوئی اور
پُپ ہیں کہ ہم کو صبر کی تلقین کر گیا
منزل قریب ہی تھی کہ کیا جانے کس لیے
گیتوں میں نظم و نثر میں، غزلوں کی شکل میں
اس تیز دھوپ میں بھی گھنی چھاؤں مل گئی
چمکے ہیں مثل چاند شب ہجر اے عزیز
وہ داغ دل وہ داغ جگر دے گیا کوئی

شکیب صاحب کے انتقال پر ملال پر۔ ایک شعر

جو سرفراز ہو کے بھی رہتے ہیں سرنگوں
اُن عالموں کا یارِ طرح دار چل بسا



دوسروں کا درد اکثر ایک افسانہ لگا
کرب کیا ہے ، چوٹ خود کھائی تو اندازہ لگا

سب پرندوں کا تھکے ہارے گھروں کو لوٹنا
شام کا منظر وہ دھندلا ، کتنا سنجیدہ لگا

بے زباں ، بوجھل قدم ، اک دوسرے سے بدگماں
ہر کوئی اک شاخ سے ٹوٹا ہوا پتہ لگا

جو پہنچ سے دور ہو وہ روشنی کس کام کی
اپنے گھر کا ہے ، اندھیرا ہی سہی ، اچھا لگا

روشنی کا قحط تھا ، بے نور تھے منظر سبھی
اس لینے بے چین سا محفل میں پروانہ لگا

شیشہ گر تھا وہ اُسے کس نے مصور کہہ دیا
اُسکو تصویریں نہیں ، بس آئینہ اچھا لگا

حال سارا کہہ چکے ہو تم سمندر کا عزیز
موج نے جو کچھ کہا وہ ماجرا کیسا لگا



جانے دل کا چراغ تھا کیا جلتے جلتے یہ بجھ گیا کیا
 روشنی کا ہے زاویہ کیا بن گیا سایہ نور کا کیا
 بے بسی ہے، گھٹن ہے، وحشت ہے ہو گیا، پر یہ سب ہوا کیا
 اتنی قدرت اسے ملی کیسے زہر پانی میں گھل گیا کیا
 بچ دی چھاؤں دھوپ کی خاطر ہم نے سودا یہ کر لیا کیا
 اپنے پھل پھول آپ کھاتا ہے پیڑ آگن میں یہ اگا کیا
 ٹھیس شائد کسی نے پہنچائی آپ ہی ٹوٹا آئینہ کیا
 ہوش اپنا ہے اور نہ منزل کا آگیا ہے یہ راستہ کیا
 دیکھتا ہے عجیب نظروں سے یہ ہمارا ہے آشنا کیا
 سر پہ الزام گر نہیں لوگے، کسینے پھر ہوگا فیصلہ کیا
 کاٹتے ہیں، یہ خود نہیں کٹتا پوچھے مت کہ دن کٹا کیا
 خون پیتے ہو کیوں عزیز اپنا
 ایسا اس میں ہے ذائقہ کیا



خوبصورت سی یہ غالی زندگی خوابِ غفلت میں گنوا لی زندگی
 یہ منظم چاند ، تاروں کا جہاں یہ ہماری -- لا اُبالی زندگی
 سوچنا ہے کیا دیا ہم نے اسے مانگتی ہے کچھ سوالی زندگی
 ہے یہ مندر کی سنہری مورتی یا بھکارن کی ہے تھالی زندگی
 بند مُٹھتی میں یہ لاکھوں کی لگے کھولے تو ہاتھ خالی زندگی
 شوخ و چیخِل اک گلہری کی طرح پھر رہی ہے ڈالی ڈالی زندگی
 راستے بُرے ہیں سبھی تیرے سبب منزلیں ہیں تجھ سے خالی زندگی
 دُور تک جلتا ہوا صحرا جہاں اُس پہ تنگے پاؤں والی زندگی
 جس نے سُن لی وقت کی آواز کو اُس نے حکمت سے بنالی زندگی
 جس نے پایا ہے اُسی نے کھودیا جس نے کھویا اُس نے پالی زندگی
 قہقہے ، سرمستیاں ، پھر سسکیاں کتنے پیانوں میں ڈھالی زندگی
 موت ہے اک روزِ روشن کی طرح ہجر کی شب سی ہے کالی زندگی
 اب نہ سمجھاؤ ، سبق ہم پڑھ چکے ہے ہماری دیکھی بھالی زندگی
 جو اُصولوں کو سدا رکھے عزیز
 اک وہی تو ہے مثالی زندگی



ہے دنیا کا نہ ملنا گر مصیبت جو مل جائے تو آفت در مصیبت
 ہے جنت یوں تو اسکا کونا کونا جو سچ پوچھو تو گھر کا گھر مصیبت
 مخالف سربراہان سفر ہیں ہے اس حالت میں ہر منظر مصیبت
 سنہرے خواب ہیں وجہ تسلی مگر تعبیر کا دفتر مصیبت
 تمنا پر تمنا پر تمنا مصیبت پر مصیبت پر مصیبت
 گھروں میں لوگ سب سمٹے ہوئے ہیں پڑی ہے پاؤں پھیلا کر مصیبت
 وسائل کی شکستہ رہ گذر پر مسائل کا جو ہے لشکر مصیبت
 یہاں تو دور تک راحت نہیں ہے کہاں چھوڑی ہمیں لا کر مصیبت
 ہماری فطرتوں کا آئینہ ہے ہماری ذات کا مظہر مصیبت
 ہماری پیٹھ پر ہے بوجھ بھاری اور اُس پہ وقت کا خنجر مصیبت
 مصیبت کے نشانے پر دل و جاں شعور و ذہن کی زد پر مصیبت
 عزیز ہم سب سکوں کے منتظر ہیں
 کھڑی ہے سب کی چوکھٹ پر مصیبت



سایہ جو اونچے گھر کا ہمارے صحن میں ہے
لگتا ہے اپنے گھر کا مقدر کہن میں ہے

ہر شب کو چاند تاروں کی بجتی ہیں محفلیں
تہا یہ آفتاب ہی کیوں انجمن میں ہے

مالی ہی پہ موقوف ہے غنچوں کی دیکھ بھال
لیکن یہ اہتمام یہاں کس چمن میں ہے ؟

کلیوں میں چننے کی جگاتی ہے آرزو
وہ آب و تاب صبح کی پہلی کرن میں ہے

ماتھے کے سلوٹوں میں ہیں پنہاں کئی سوال
اُنکا ہر اک جواب نمایاں نہیں میں ہے

اہلِ وفا . . . بنِ سخن سے ہے مالا مال
اک آسمان ایسا بھی ارضِ دکن میں ہے

کتنی سمٹ گئیں ہیں یہ لمبی مسافتیں
دل ہے دیارِ غیر میں دھڑکن وطن میں ہے

کس کو عزیز ہوتی نہیں نیند رات کی
اچھی صحت کا راز بھی پنہاں تھکن میں ہے

سعودی عرب سے مُستقلّاً واپسی پر حلقۂ ارباب ذوق،

جدہ کی منعقدہ وداعی تقریب میں ایک تاثر

(اپریل / ۱۹۸۶ء)



در پہ سائل کی طرح آ کے ٹھہر جاتا ہے اتنا بیزار کبھی وقت بھی کر جاتا نہ

یوں ٹھہر جاتے ہیں ایام بھی چلتے چلتے جیسے راہ گیر سر راہ ٹھہر جاتا نہ

کتنے ان دیکھے الم ساتھ ہوا کرتے ہیں جب سفر پر کوئی بے اذن سفر جاتا نہ

گھر کے سامان کی مانند ہوں بکھرا بکھرا گھر بکھر جائے تو انسان بکھر جاتا نہ

جوشِ سیلاب ہے برسات کے بل پر ورنہ خشک سالی ہو تو یہ بھی اُتر جاتا ہے

کیا نئی بات ہے دنیا جو مگر بیٹھی ہے سر پہ سورج ہو تو سایہ بھی مگر جاتا ہے

طور جینے کے ضروری ہیں جہاں میں ورنہ جس کو جینے کا سلیقہ نہ ہو مر جاتا ہے

آج اُمید کی پھر ایک کرن لیکے عزیز

صبح کا بھولا ہوا شام کو گھر جاتا ہے

۱۹۸۶ء وداعی تقریبوں میں پڑھی ہوئی غزلیں

بمکان معزز و مخلص دوست ابوظفر



ہونی تو ہو کر رہے گی ، بے بسی رہ جائیگی
 جستجو ، خود اپنا منہ تکتی ہوئی رہ جائیگی
 ہوش پر ہو جائے گا حاوی جنون بے حسی
 عقل اپنی کھڑکیوں سے جھانکتی رہ جائیگی
 لے اڑے گی راہ سے ہم کو مقدر کی ہوا
 آرزو محور پہ اپنی گھومتی رہ جائیگی
 زندگی ہے وہ شراب کیف و مستی کہ جسے
 پیچھے جی بھر کے پھر بھی تشنگی رہ جائیگی
 توڑ کر بندھن چلا جائے گا قیدی قید سے
 اپنی تنہائی پہ روتی جھکڑی رہ جائیگی
 خاک ہو جائیگا پروانہ فنا ہو جائیگا
 جذبہء الفت کو دنیا جا بختی رہ جائیگی
 گھر سے لیکر گور تک ہوگا خموشی کا سفر
 زندگی اپنا جنازہ دیکھتی رہ جائیگی
 نام لیا قبر پر ہوگا نہ کوئی اے عزیز
 اک ہمارے نام کی تختی لگی رہ جائیگی



اگر بے اعتنائی سے روانہ ہو گیا ہوتا
جہاں اسباب رکھ دیتا ٹھکانہ ہو گیا ہوتا

نہ ہوتی فکر روزی تو قسم ہے فاقہ مستی کی
کرم سے اُسکے جاری آب و دانہ ہو گیا ہوتا

یہ دل فولاد ہے ، پر جذب کر لیتا ہے تیروں کو
و گر نہ پھینکنے والا نشانہ ہو گیا ہوتا !

خرد مجھ کو عطا کر کے مقید کر لیا ورنہ
جنوں ہی میری بخشش کا بہانہ ہو گیا ہوتا

ابھی تک سلسلہ باقی ہے ذکر یار کا دل میں
و گر نہ بھول کر اُس کو زمانہ ہو گیا ہوتا

نہ ہوتی کار فرما گر مشقتِ تلم عالم میں
کبھی کا ڈھیر سارا کارخانہ ہو گیا ہوتا

عزیز اب تک ہے میرے دل کے گوشے میں یہی حسرت
بلاتا پھر کوئی مجھ کو ، روانہ ہو گیا ہوتا



ہوتا نہیں اُجالا نورِ سحر سے پہلے
رختِ سفر نہ باندھو وقتِ سفر سے پہلے

کیسی ہے اپنی بستی یہ بعد میں سمجھنا
واقف تو آپ ہو لیں خود اپنے گھر سے پہلے

سائے کی اہمیت اب اس درجہ بڑھ گئی ہے
سب چھت بنا رہے ہیں دیوار و در سے پہلے

وجہِ بقائے صُحِ جمہوریت کی خاطر
اسبابِ خیرِ دیدو سامانِ شر سے پہلے

دل بستگی کو میری آئے ہوئے ہو ، مانا
پر خیریت تو پوچھو اس چشمِ تر سے پہلے

اس مرگ ناگہاں سے ، ہم بے خبر نہیں تھے
محسوس کر لیا تھا یہ دلِ نظر سے پہلے

دیکھو عزیزِ تم کو ، تکتے ہیں سب مناظر
شائد گذر چکے ہو اس رہِ گذر سے پہلے



جس دن سے کناروں نے پانی میں اُچھالا ہے
طوفاں نے جگہ دی ہے، موجوں نے سنبھالا ہے

موجوں کو اُلجھنے کا موقع نہ دیا ہم نے
اس طرح سینے کو طوفاں سے نکالا ہے

مشکل تھا قدم رکھنا اس ریت کی دنیا میں
پوچھو نہ توازن کو کس طرح سنبھالا ہے

مانگی نہ نیا ہم نے غیروں کے چراغوں سے
مانگے کا اُجالا بھی کہیں کہ اُجالا ہے ؟ !

پائی نہ محبت کی ہلکی سے حرارت بھی
ہر آنکھ کو پرکھا ہے ، ہر دل کو کھنگالا ہے

ٹکراؤ ہے ندیوں کا ، ہر روز کا سنگم ہے
گنگ و جمن ہیں آنکھیں ، دل اپنا ہمالا ہے

دنیا میں کمی کیا ہے ، دل توڑنے والوں کی
لیکن اے عزیز اُسکا انداز نرالا ہے



یوں اپنے آپ کو خطرات میں ہم خود ہی لا بیٹھے
جہاں شب خون کا ڈر تھا وہیں خیمہ لگا بیٹھے

کبھی ہنس کر گزاری ہیں چٹانوں میں سیہ راتیں
کبھی پپیل کی ٹھنڈی چھاؤں میں گھبرا کے آبیٹھے

کبھی ہم تھک کے بیٹھے ہیں کسی بے جان مورت سے
کبھی دوڑے ہیں اتنا کہ ہواؤں کو تھکا بیٹھے

کبھی راتوں کے سنائے میں دل سے بات کرتے ہیں
کبھی ہم دن کے شور و غل میں خود کو بھی ٹھلا بیٹھے

گذر جاتے ہیں رن تو پھر پلٹ کر آ نہیں سکتے
تصور میں مگر اُن کو عقیدت سے سجا بیٹھے

ستائیں جب کبھی یادیں ہمیں بیتے ہوئے پل کی
سنائی داستاں دل کو ، ان آنکھوں کو رُلا بیٹھے

ہمیں دانا سمجھ کر یہ زمانہ دور جا بیٹھا
مسائل ہم کو دیوانہ سمجھ کر پاس آ بیٹھے

عزیز ہم سر پھرے لوگوں کی دنیا ہی نرالی ہے
جہاں دل آگیا اپنا وہیں پر دل لگا بیٹھے



یہ چڑھتی دھوپ نے دیکھا کہاں ہے
 کہاں دیوار ہے سایہ کہاں ہے
 اُجالے بانٹتا ہے دن میں سورج
 مگر یہ رات کو رہتا کہاں ہے
 در و دیوار ہی سے گھر نہیں ہے
 یہ گھر والوں کو اندازہ کہاں ہے
 یہ مانا خون کے رشتے ہیں سارے
 بتاؤ درد کا رشتہ کہاں ہے
 سرائی ، جام و ساقی ، میلہ ہے
 مگر وہ ذوقِ رندانہ کہاں ہے
 بدلتے موسموں کا ہے یہ موسم
 کہ ہر دن ایک سا رہتا کہاں ہے
 پتہ منزل کا سب کو دینے والا
 کسی کو راستہ دیتا کہاں ہے
 غنیمت ہے یہ مہلت چار دن کی
 پھر اُسکے بعد یہ موقع کہاں ہے
 مسافر ہیں سبھی اُتدھے سفر کے
 کسے معلوم ہے جانا کہاں ہے
 مشینیں دوڑتی ہیں ہر سڑک پر
 کسی کا نقشِ پا ملتا کہاں ہے
 پھرو گے آئینہ لیکر یوں کب تک
 عزیز اب دیکھنے والا کہاں ہے



غم کا سایہ اُوج پر آیا شبِ تاریک میں
 بن کے میرا راہ بر آیا شبِ تاریک میں
 کرسکا نہ شوق جس کو روشنی میں دن تمام
 ذوق ایسا کام کر آیا شبِ تاریک میں
 تم سلگنے کا یہ فن سکھے ہو دن کی دھوپ میں
 ہم کو جلنے کا ہنر آیا شبِ تاریک میں
 جو گیا تھا روزِ روشن سے اُجالا مانگنے
 لوٹ کر وہ اپنے گھر آیا شبِ تاریک میں
 زندگی سے کھیتے رہنا تھا جس کا مشغلہ
 تھک کے وہ بھی بام پر آیا شبِ تاریک میں
 دن کے ہنگاموں میں تھا اک جوش کا عالم مگر
 ہوش کا پہلو نظر آیا شبِ تاریک میں
 دن چڑھے تک نیند کے عالم میں ہم مدہوش تھے
 ہوش تو آیا ، مگر آیا شبِ تاریک میں
 گر رہے تھے میرے دامن میں ستارے ٹوٹ کر
 میرا دل کچھ ایسا بھر آیا شبِ تاریک میں
 فکر یہ ہے ، کیا خبر لایا خدا جانے عزیز
 خط کو لیکر نامہ بر آیا شبِ تاریک میں



ناز و نیاز دھوپ کے سر پر اٹھائیے
 سر پر یہ آسمان اٹھائے تو کیا ہوا
 محلوں کے خواب ڈھیر ہوئے ، آنکھ کھل گئی
 مدت سے آرزو تھی تمہیں دولتِ غم کی
 فطرت یہ ٹوکتی ہے کہ رہنا ہے سرنگوں
 بلوائی در پہ آکے کھڑے ہیں حضور کے
 درپردہ سازشی ہیں کئی قتل عام کے
 پتھر پڑے ہوئے ہیں یہاں کاغذات پر
 ظلمت کدے میں دھوپ کی کرنیں بھی بجھ گئیں
 اوروں کی کشتیاں تو بہت دور جا چکیں
 لیکن نہ آسمان کی طرف سر اٹھائیے
 اس کا حلق یہ تو نہیں گھر اٹھائیے !
 دن چڑھ چکا ہے اب تو یہ بستر اٹھائیے !
 پلکوں پہ آگرے ہیں یہ گوہر اٹھائیے
 حالات کہہ رہے ہیں میاں سر اٹھائیے
 قرطاس و قلم پھینک کے خنجر اٹھائیے
 انگلی ، سوال یہ ہے کہ کس پر اٹھائیے ؟
 یکسر نمائشی ہے یہ دفتر اٹھائیے
 اس حال میں نہ منت اختر اٹھائیے
 اب ہوش آگیا ہے تو لنگر اٹھائیے
 مجنوں ہمارے وقت کا ابلیس ہے عزیز
 پتھر نہ اس پہ ماریے کنکر اٹھائیے



چوٹ کھانا ، مسکرانا دل جگر کا کام ہے
 چھوٹنا ، گرنا ، ترخ جانا ہے شیشے کی صفت
 تو اسے کعبہ بنا ، کاشی بنا کہ دل بنا
 رونے والوں کو ہسانا درد مندوں کا ہے کام
 مشورہ مانے نہ مانے یہ مسافر کی خوشی
 ہر قدم اس کے قدم سے میں ملاتا ہوں مگر
 حق کے آگے اُف نہ کرنا ہی بشر کا کام ہے
 جوڑنا ، اس کو بنانا شیشہ گر کا کام ہے
 یہ مرے گھر کا نہیں ہے ، تیرے گھر کا کام ہے
 آپ اپنے اشک پینا چشم تر کا کام ہے
 ہر قدم پر راہ دکھلانا خضر کا کام ہے
 اب مرے ہمراہ چلنا ہمسفر کا کام ہے
 مطمئن میں ہو چکا ہوں اس کو بے دیکھے عزیز
 دیکھ کر ایمان لانا کم نظر کا کام ہے

سعودی عرب سے لوٹنے کے بعد پیش آئے تجربات پر۔۔۔ ایک تاثر
(۱۹۸۸ء)

جب سفر سے لوٹ کر ہم گھر چلے تو کیا نہ تھا
جو گھروندہ ہم نے مٹی کا بنایا تھا نہ تھا
شہر کے منظر بھی تھے کچھ اس طرح بدلے ہوئے
جیسے نظروں نے انہیں پہلے کبھی دیکھا نہ تھا
تھا یقین ہر شے کی حالت کے تغیر کا مگر
یوں زمانے کے بدل جانے کا اندازہ نہ تھا
سرد مہری ، تیکھے تیور ، ہر نظر بدلی ہوئی
نفرتیں ہی نفرتیں تھیں پیار کا جذبہ نہ تھا
مجھ سے اکثر کہہ رہی تھی میرے اپنوں کی نظر
میں وہی تھا پر مرا چہرہ ، مرا چہرہ نہ تھا
لے لیا چپ چاپ ہنس کر سر پہ ہر الزام کو
کچھ صفائی میں کہیں ایسا کوئی موقع نہ تھا
سادہ لوحی پر مری تنقید کی بوچھاڑ تھی
اور زمانے کی سیاست کا کوئی چرچا نہ تھا
یوں بھی تنہائی ہمیشہ ساتھ رہتی ہے ، مگر
اس سے پہلے تو کبھی میں اس قدر تنہا نہ تھا
میں نے چاہا تھا چٹانوں میں گذاروں زندگی
آشیانہ ہو چمن میں یہ کبھی سوچا نہ تھا
ہم تو ماضی کے جھروکوں میں سدا کھوئے رہے
کیا کریں کہ ہم پہ فردا کا دریچہ وا نہ تھا
تھا جو سرمایہ کبھی سودا نہ تھا سر میں عزیز
اور کبھی سودا جو تھا تو پاس سرمایہ نہ تھا



فطرتی غم آج مصنوعی خوشی میں غرق ہے
کرب میں ڈوبا ہوا چہرہ ہنسی میں غرق ہے

روزنوں سے جھانکتی ہے تیرگی ہی تیرگی
رونقِ محفل بظاہر روشنی میں غرق ہے

برف میں ڈوبی ہوئی سر سبز وادی یوں لگے
عالم احساس جیسے بے جسی میں غرق ہے

گوٹکا ساحل چیمختی موجوں سے آخر کیا کہے
اب سمندر خود ہی بحر خامشی میں غرق ہے

جوش عالمگیر بھی ہے ، ہوش دامنگیر بھی
یوں خرد اہل جہاں کی بے بسی میں غرق ہے

حسنِ فطرت پر یہ دھندلا پن کہاں سے آگیا
جو بھی منظر ہے یہاں آلودگی میں غرق ہے

حال کا غم ، فکر فردا ، ذکر ماضی الاماں
اک تلاطم سا مزاج آدمی میں غرق ہے

جاگتی آنکھوں میں یہ سوئی ہوئی دنیا عزیز
ایسا لگتا ہے سرابِ آگہی میں غرق ہے



یہ ساحل کے تماشائی نگہبانوں میں رہتے ہیں
خبر اُن کی نہیں رکھتے جو طوفانوں میں رہتے ہیں

سیانہ پن یں ب - سیانوں میں نہ مل بیٹھیں
وہی دانا ہیں دنیا میں جو دیوانوں میں رہتے ہیں

چمن میں رہنے والے ہی چمن کا خون پیتے ہیں
نہ جو خون دیتے ہیں وہ ویرانوں میں رہتے ہیں

یہ شیشے کے مکانوں سے چمن کی خاک اچھی ہے
وہ گل ہی کیا چمن والو جو گلدانوں میں رہتے ہیں

شہر میں رہ کے یہ کہتے ہو دنیا دیکھ لی ہم نے !
جہاں دیدہ تو وہ ہیں جو بیابانوں میں رہتے ہیں

نہ ہم دیوں اُچھالو تم ، ذرا پرکھو ، ذرا سمجھو
وہ سکتے تو نہیں ہیں ہم ، جو نذرانوں میں رہتے ہیں

جنتیں پوچھیں تو مجرم ہوں ، نہ پوچھیں تو مخالف ہوں
عزیز ایسے صنم ہی اب صنم خانوں میں رہتے ہیں



دن نکلتے ہی سنور جاتا ہے شام کے ساتھ ہی مرجاتا ہے
 کاش پرداز کی طاقت مل جائے راستے بند ہیں ، گھر جاتا ہے
 اپنے ہمراہ سمندر لیکر ایک سیپی میں اتر جاتا ہے
 کب سے اسباب لئے ٹھہرے ہیں کچھ تو کہیں کہ کدھر جاتا ہے
 چھوڑ دو کشتیوں کو ساحل پر سوئے گرداب اگر جاتا ہے
 پھول کی طرح سمنے کو عزیز
 گرد کی طرح بکھر جاتا ہے



اڑ کے ذرے خاک کے اس انجمن تک آگئے جتنا قد دو ہاتھ کا تھا وہ گنگن تک آگئے
 موزیوں کا دشت و صحرا سے جو دل اکتا گیا دل کے بہلانے کو وہ ارض چین تک آگئے
 ہم کہ تن آساں تھے پر آئے گردشِ لیل و نہار جستجو کی دوڑ میں دار و در سن تک آگئے
 پھیلتا ہی جا رہا ہے اجنبیت کا حصار اس کے باہر کب ہوئے ہم، بوطن تک آگئے
 بلبل سادل ہے لیکن اُس کو ڈھاتا ہے محال اپنا سامنہ لیکے واپس کوہِ سن تک آگئے
 بلبل و گل کے چلن کو دیکھ کر کانٹے سبھی رونگٹوں کی شکل میں میرے بدن تک آگئے

جن کو گودی میں کھلایا تھا وہی بچے عزیز

مجھ سے اونچے ہو گئے بڑے تن تک آگئے



کوئی ہرگز نہ یہ سمجھے کہ انجانے میں آبیٹھے
چمن میں دل جو گھبرایا تو ویرانے میں آبیٹھے

شریفوں نے تو قبضہ کر لیا ہے ساری بستی پر
ہوئے کچھ ایسے ہم رسوا کہ میخانے میں آبیٹھے

انہیں پی کر بھلانے کی ابھی تدبیر سوچی تھی
اُتر کر میری آنکھوں سے وہ پیمانے میں آبیٹھے

زمانے میں جو بدلا طور پوری آستینوں کا
تو سارے آستیں کے سانپ داستانے میں آبیٹھے

نہ تھی ہرگز نہ تھی ہم کو توقع سرد مہری کی
فریب دوستی میں ہم تو یارانے میں آبیٹھے

بجوںِ سادگی نے کر دیا شطرنج کا مہرہ
کہاں رہنا تھا ہم کو اور کس خانے میں آبیٹھے

نہ تھی شاید کہیں منزل زمانے کے مسائل کی
ہوئی جب رات تو سب میرے کاشانے میں آبیٹھے

انہیں دیر و حرم میں ڈھونڈتے پھرتے تھے ہم کب سے
ترس آیا تو وہ تسبیح کے دانے میں آبیٹھے

بہت ضدی ہے دل ، اپنا پر لیا کچھ نہیں جانے
نہ آتا تھا عزیز اس دل کے بہکانے میں آبیٹھے



اُجھن کو اور بھی کچھ اُلجھا گئی ہیں آنکھیں
ماحول کی گھٹن سے اکتا گئی ہیں آنکھیں

دنیا کے دیکھنے کو درکار ہے بصیرت
لیکن بصارتوں سے شرما گئی ہیں آنکھیں

اب رات ہو چکی ہے پلکوں کو مُوند لیجے
وقتِ سحر یہ ہم کو سمجھا گئی ہیں آنکھیں

کچھ اور ہی خبر تھی ، منظر کچھ اور ہی تھا
ہر راز زندگی کا بتلا گئی ہیں آنکھیں

کانوں میں مچھ رہی ہے سکوں کی کھنکھناہٹ
آسودگی کے غم میں مُر جھا گئی ہیں آنکھیں

کل کے خریدنے کو ہم آج بیچ آئے
آنکھوں پہ کیسا چشمہ لگوا گئی ہیں آنکھیں

فکرِ جدید کو ہے امروز کی تمنا
فردا کے خوف سے یوں پتھرا گئی ہیں آنکھیں

ہر اک غبارِ غم سے ہوں پاک ، اس غرض سے
پلکوں کو آنسوؤں سے نہلا گئی ہیں آنکھیں

فطرت کے آئینے میں انسان کا یہ چہرہ
نظروں میں جب سے آیا شرما گئی ہیں آنکھیں

اسکا گُماں نہیں تھا لیکن عزیز پھر بھی
دنیا کو ایسا منظر دکھلا گئی ہیں آنکھیں



ہے مرا گھر بار میں بے گھر نہیں
دیکھنے والا کوئی گھر پر نہیں

جو بھی منظر ہے مقابل ہے مرے
کوئی منظر اب پس منظر نہیں

نفس اور دل کے مخالف جنگ ہے
اس لڑائی میں کوئی لشکر نہیں

میں نے لوٹا دی امانت جو بھی تھی
بوجھ کوئی اب مرے دل میں پر نہیں

اس محبت کے نشے میں چور ہوں
جس محبت کا کوئی پیکر نہیں

سامنے آکر ملا مجھ سے نظر
وار کر مجھ پر ، مگر چھپ کر نہیں

کتنی پرتوں میں بٹا ہے دل ترا
بات جو اوپر ہے وہ اندر نہیں

وقت کی پہ دھڑکنیں ہیں تیز گام
پر ہماری سانس سے بڑھ کر نہیں

خوب ہے صحرا نوردی آئے عزیز
دشت میں پھر شوق سے ، در در نہیں



بھولنے والے نہ تڑپاتا تو کیا جاتا ترا
 دل سے دل اور ذہن سے ہے ذہن کا گر رابطہ
 حافظہ بھی چھین لے جاتا تو کیا جاتا ترا
 یاد آتے ہی چلا آتا تو کیا جاتا ترا
 بڑھ گیا ترکِ تعلق سے تعلق اور بھی
 کوششیں تجھ کو بھلانے کی سب الٹی ہو گئیں
 کون سا رشتہ ہے یوں بھی دائمی اے بے وفا
 اب کوئی منظر نہیں ایسا کہ جس میں تو نہیں
 دائرہ میری بصارت کا بہت محدود ہے
 میں رگِ جاں میں کہاں ڈھونڈوں تجھے تو ہی بتا
 حوصلہ اتنا جگا جاتا تو کیا جاتا ترا
 دل کی آنکھیں کھول کر جاتا تو کیا جاتا ترا
 ظاہری آنکھوں سے میں باطن کو دیکھوں کس طرح
 کون بوں میں اتنا بتلاتا تو کیا جاتا ترا
 آئینہ تیرا، تری صورت، ترا جلوہ، مگر

دل کے گوشے گوشے میں ہے تو ہی تو لیکن عزیز

مجھ کو آنکھوں سے نظر آتا تو کیا جاتا ترا



کچھ کہا میں نے تو دنیا نے مرا بچپن کہا
چپ رہا تو میری خاموشی کو گونگا پن کہا

الجھنوں کو میں نے سلجھانے کی جب بھی بات کی
اُس نے میرے مشورے کو اک نئی الجھن کہا

اس مکاں کو چار دیواروں سے کیا بانٹا گیا
چار دیواری کو سب نے اپنا گھر آنگن کہا

بند رہ کر دریچہ دیکھ سکتا ہے اگر
کیا غلط میں نے کہا تھا گر اُسے چلمن کہا

آگ بر سے یا کہ پانی کچھ تو برسا اس برس
آگ ہی برسی تو میں نے دھوپ کا ساون کہا

مانگ اسکی بھر رہے ہیں لوگ سب بارود سے
شاعروں نے جس جہاں کو چاند سی دلہن کہا

اس سے اُن بن کا سبب تھی اک غلط فہمی عزیز
اُس نے ”میلاتن“ سنا جو میں نے ”اُجلا من“ کہا



آپ کے واسطے انا سب کچھ
میرے حق میں مرا خدا سب کچھ

آنکھ میں آکے اشک کا قطرہ
کہہ گیا دل کا ماجرا سب کچھ

تھا سلیقہ نہ جس کو دینے کا
اُسکے ہاتھوں میں دے دیا سب کچھ

رات کیا کیا نہ خواب دیکھے تھے
دن جو نکلا تو کیا ہوا سب کچھ

میرا کچھ بھی نہیں ہے دنیا میں
آپ کا صرف آپ کا سب کچھ

سن کے دیوار چپ رہی لیکن
کہہ چکا ہم سے آئینہ سب کچھ

رہ گئے تم عزیز ساحل پر
بہتے پانی میں بہہ گیا سب کچھ

۶ / ڈسمبر ۱۹۹۲ء کے فسادات کے پس منظر میں.....

زباں ہو مُشتعل تو سرد یہ حالات کیا ہونگے
 نہ سُلگاؤ ، کہ پھر خاموش یہ جذبات کیا ہونگے
 سزا نا کردہ مجرموں کی بُھگتنے آرہے ہیں ہم
 خدا جانے کہ مُستقبل میں الزامات کیا ہونگے
 خطا کانٹوں کی تھی اور تُو سزا پھولوں کو دیتا ہے
 یہ سوچ ائے باغباں کلیوں کے احساسات کیا ہونگے
 ہمیں پر گر رہی ہیں آج اپنے گھر کی دیواریں
 یہ ڈر اپنوں سے ہے تو غیر سے خدشات کیا ہونگے
 نگر کا ڈوب جانا اور کھڑی فصلوں کا بہہ جانا
 ستم اس سے سوا ائے موسمِ برسات کیا ہونگے
 غریبی ، تنگدستی پر فسادوں کا اثاثہ ہے
 یہ عطیے مل چکے ، اب یہ کہو سوغات کیا ہونگے
 رنگے ہیں خونِ ناحق سے وہ اپنے ہاتھ اور دامن
 یہ فطرت و حشیوں کی ہے تو پھر بد ذات کیا ہونگے
 عزیز اس دور کے خونخوار پنجوں سے جو بچ نکلیں
 وہ سب دیکھیں گے کل پر آج کے اثرات کیا ہونگے



آگیا گرداب میں آخر سفینہ اِن دنوں
اور ہی لگتا ہے طوفان کا ارادہ اِن دنوں

اُڑتی حسرت ، بہتا پیسہ ، دوڑتی پھرتی ہوس
کیوں ہوا سے بات کرتی ہے یہ دُنیا اِن دنوں

وقت کے پتھڑوں پہ دیکھو اُڑ رہے ہیں آپ ، ہم
دو قدم چلنا بھی ہے کس کو گوارا اِن دنوں

آپ اپنے سائے سے چونکا ہوا ہے آدمی
موت کا سایہ ہے جیسے اُس کا سایہ اِن دنوں

جس قدر اُونچی اُٹھائی جاتی ہے گھر کی فصیل
اُس قدر اُٹھتا ہی جاتا ہے بھروسہ اِن دنوں

اب لب و لہجہ بتا دیتا ہے دل کی بات کو
حاجتیں جیسی ہیں بس ویسا ہے لہجہ ان دنوں

آج کا دن کٹ رہا ہے خیر سے لیکن عزیز
آج سے بڑھ کر ہے دل کو کل کا خدشہ اِن دنوں



آج خطرے میں نظر آتے ہیں آثارِ چمن
شاخِ گل سوکھی ہوئی ہے نم ہے دیوارِ چمن

چار سو پھیلا ہوا ہے نفرتوں کا خارزار
آبلہ پا پھر رہا ہے بن میں بیمارِ چمن

پھول خود اپنی ہی خوشبو سے ہراسانی میں ہیں
رفتہ رفتہ ہو رہے ہیں فاش اسرارِ چمن

غنجے خوش رنگ میں پہلی سی رعنائی کہاں
گھٹ چکے ہیں آبِ مصنوعی سے اقدارِ چمن

پتہ پتہ ، ڈالی ڈالی کیڑ کے قبضے میں ہے
زہر کا چھڑکاؤ کرتے ہیں وفادارِ چمن

پھول ، غنجے ، نرم ہریالی ، طیورِ خوش نوا
حسنِ فطرت ہے انہیں سے ان سے دربارِ چمن

فطرت گلشن بھی بدلی موسموں کے ساتھ ساتھ
اس تغیر سے بھی ہے آگاہ معمارِ چمن

پھول کی پہچان ہے نہ جس کو خوشبو کی پرکھ
بن گیا وہ اپنی قسمت سے خریدارِ چمن

اس کے دل میں ڈر نہیں رہتا اُڑنے کا عزیز
لگ رہا ہے اپنا ویرانہ ہی حقدارِ چمن



اپنی تہذیب کی تصویر جلادی تو نے
راکھ دریا میں محبت کی بہادی تو نے

خونِ اسلاف سے تعمیر ہوئی تھی جس کی
ایک ٹھوکر میں وہ دیوار گرا دی تو نے

رنجِ اس کا تو نہیں ہے کہ تیرے قبضے میں
دولتِ لوح و قلم تھی جو لٹا دی تو نے

کیا کہوں ، دل کی عمارت کو سنبھالا کیسے
جب مرے صبر کی بنیاد ہلا دی تو نے

بجھ سکے گی نہ کبھی شمع محبت تجھ سے
ہم نے مانا کہ ہواؤں کو ہوا دی تو نے

یاد کرنا ہے خطا ، تجھ کو بھلانا دو بھر
چاہنے والوں کو کیا خوب سزا دی تو نے

جذبہ شوق میں لکھا تھا جسے ساحل پر
آج وہ ریت کی تحریر مٹا دی تو نے

خانہ دل میں ہے محفوظ محبت اے عزیز
نفرتوں کو تو نگاہوں میں جگہ دی تو نے



شکاری اپنی کوتاہی پہ پچھتایا تو کیا حاصل
 شکستہ جال میں شہباز بھی آیا تو کیا حاصل
 کڑی محنت پہ پانی پھیرتی ہے بھول چھوٹی سی
 ذرا سا ہی سہی شیشے میں بال آیا تو کیا حاصل
 ضروری ہے کسی گتھئی کا سلجھانا ضرورت پر
 وہ ساعت بیتنے پر حل نکل آیا تو کیا حاصل
 توقع پر وہ جس نے دھوپ سہہ لی تھی مسافت کی
 سر منزل اُسے اشکوں سے نہلایا تو کیا حاصل
 سلگتی کھیتیاں تو یوں بھی بارش کو ترستی تھیں
 انہیں پرائے فلک تو قہر برسایا تو کیا حاصل
 ال ناداں نہ ہو مسرور یوں حسرت نکلنے پر
 جسے کھونا یقینی ہے اُسے پایا تو کیا حاصل
 مناسب ہے اُسی کا ساتھ جو قد کے برابر ہو
 جو سائے سے بڑا کوئی ہمسایہ تو کیا حاصل
 جسے کھلنا نہیں آتا اسے غنچہ نہیں کہتے
 چٹخنا کام تھا اس کا وہ مرجھایا تو کیا حاصل
 ہمیں اس خوش گمانی سے تسلی ہو نہیں سکتی
 جو خود آتا نہیں وہ یاد بھی آیا تو کیا حاصل
 عزیز ہم جس کو بھولے تھے متاعِ حافظہ دے کر
 اُسی کے ذکر کو پھر تم نے دہرایا تو کیا حاصل



وقت ہی کا کھیل ہے جس نے دیا ہے تلّ اُنہیں یہ بلا کیا چیز ہے معلوم ہو کہ کلّ اُنہیں
 کتنے دانشور نہ جانے اُن سے سیکھے ہیں سبق سوچ کر آئے بے خبر کہنا ذرا پاگل اُنہیں
 مَحْمول تھے جن کے مقدر میں وہ سب مُر جھاگئے جن کی قسمت میں تھے قُطر ل گئے سب پھل اُنہیں
 جتنی اُونچائی پہ اُڑنے کی تمنا دل میں ہے اتنی گہرائی میں لے جایگا یہ دلدل اُنہیں
 ریگتے کیڑے بھی پہنچے ہیں سر شاخ شمر آئے ہوا دنیا ذرا اب دعوتِ بلچل اُنہیں
 جن کے دل میں تھی مہکتی منزلوں کی آرزو خار زاروں میں سدا چلنا پڑا پیدل اُنہیں
 تھا بہت ہانوں کو اپنی بدنمائی کا ملال اِس لیے قدرت نے بخشا مَحْمول کا آچل اُنہیں
 کیسا بُوّارہ کیا ہے اب کے ساون کیا کہیں تیر کی تلخی ہمیں اور جون کا جل تھل اُنہیں

شہر میں آکر بھی رُسوائی کا شِلوہ ہے عزیز
 راس کیوں آتا نہیں آخر کوئی جنگل اُنہیں



وقت کے سیلاب میں بہتا ہوا دریا رہا
اُس کو کیا معلوم کہ کیا بہہ گیا اور کیا رہا

خوف کی سولی پہ ہے سارا جہاں لٹکا ہوا
تلخی حالات سے ہم سب کا سمجھوتا رہا

ہو گئی ہر ایک فریادی کی بینائی بحال
اس قدر قانون اپنے وقت کا اندھا رہا

آدمیت بے لباسی پر سدا روتی رہی
اُسکی چادر اوڑھ کر میں سرخرو ہوتا رہا

میں نہ کہتا تھا نہ کر اب تو کسی کا اعتبار
دیکھ تو اس انجمن میں آج بھی تنہا رہا

دیکھنا سارا سمندر آنکھ سے بہہ جائیگا
گر سر مڑگاں لرزتا ایک بھی قطرہ رہا

دل ہمارا سارے اندیشوں کا مرکز ہے عزیز
پھر بھی تنہا کار راز زیست میں لڑتا رہا



زندگی تجھ سے بڑا دلدل نہیں دیکھا کوئی
وہ پہلی تو ہے جس کا حل نہیں دیکھا کوئی

جس کو مستقبل سمجھتے ہیں وہ بس اک خواب ہے
آج کا دن سب نے دیکھا، کل نہیں دیکھا کوئی

جو سما جاتے ہیں بینائی کی مانند آنکھ میں
اُنکو آنکھوں سے کبھی اوجھل نہیں دیکھا کوئی

ڈال دیتے ہیں فردہ رُخ پہ خوشیوں کا نقاب
بے کلی میں بھی ہمیں بے کل نہیں دیکھا کوئی

آدمیوں سے، گھروں سے بھر گیا سارا شہر
سچ ہے کہ اتنا بڑا جنگل نہیں دیکھا کوئی

باغ میں اونچے درختوں کی نہیں کوئی کمی
بس یہ روتا ہے کہ ان میں پہ پھل نہیں دیکھا کوئی

تو نصیحت سے کبھی نہ باز آئیگا عزیز
تیرے جیسا دہر میں پاگل نہیں دیکھا کوئی



رہبر کسی کا ہے نہ ہی رستہ چلے چلو
منزل کی جستجو ہو تو تنہا چلے چلو

ہوتی ہے رہبروں کی تو اندھوں کو ضرورت
ہم کو ملا ہے دیدہٴ بینا چلے چلو

رُک جاؤ دیکھتے ہی سیاہ رات کے نشاں
ہوتے ہی صبح نور کا تڑکا چلے چلو

رُکنا ہو تو رُک جاؤ کسی پیڑ کی طرح
چلنا ہو تو بصورتِ دریا چلے چلو

رُکنے سے احتمالِ وجودِ سکوت ہے
بے وقت کا رُکنا بھی ہے بے جا چلے چلو

کہتی ہے کیا یہ تم سے سنو گردشِ سفر
ہے زندگی کا نام ہی چلنا چلے چلو

غیروں کی بات میں تو نہیں کوئی بل عزیز
کر کے خود اپنے بل پہ بھروسہ چلے چلو



نہ چھیڑ اس حال میں بادِ خزاں قصّے تو گلشن کے
 نہ موسم ہے بہاروں کا نہ دن ہیں اب وہ بچپن کے
 رفو سازی سے واقف ہو نہ گر معلوم سیون کے
 گریباں چاک کیجے آپ تو ماہر ہیں اس فن کے
 یہ بے فکری ، مری خانہ بدوشی ہی غنیمت ہے
 نہ بجلی کا یہ ڈر اچھا نہ اندیشے نشیمن کے
 خوشامد سے تو پہلے کام سب بنتے تھے ، لیکن اب
 وہیں پر بات بنتی ہے جہاں سکہ زرا کھنکے
 اگر ہو سائباں سر پر مُصیبت ٹل نہیں سکتی
 ہمارے سر پہ گھر کی چھت ہے اُس پر پیڑ آنگن کے
 نظر آتے نہیں لیکن وہ سب کو دیکھ لیتے ہیں
 یہ پردے کی حقیقت ہے ، یہ ہیں اسرارِ چلمن کے
 تسلی چاہیے تو شعر میرے غور سے پڑھنیے
 مرے اشعار میں مل گے سب راز اُلجھن کے
 عزیز اب خوشہ چینوں کی قطاریں ہی قطاریں ہیں
 ذرا دیکھو تو ان میں کتنے رکھوالے ہیں خرمن کے



ہم کو مئے سے کوئی مطلب ہے نہ میخانے سے
کھیلتے رہتے ہیں ٹوٹے ہوئے پیانے سے

ہاتھ رکھدے نہ کہیں دھکتی دگوں پر اپنا
اس لئے دُور رہا کرتے ہیں دیوانے سے

پھل جو بے خوف تھے ہتھوں میں چمپا کر خود کو
گر گئے شاخ کی نظروں میں کھٹک جانے سے

پیڑ اب جھوم کے سنتے ہیں ترنم اُن کا
کون روکے گا ہواؤں کو غزل گانے سے

یہ بھی اک رمز حقیقت ہے اسے کیا کہیے
جتنے کردار ہیں منسوب ہیں انسانی سے

جاچکا سانپ نہ پیڑ یوں لکیر اب اسکی
لوٹ کر وقت نہیں آئیگا پچھتاتے سے

دھوپ کیا چیز ہے محسوس ہوا اب ہم کو
اک ذرا نیم کے سائے میں ٹھہر جانے سے

ہے تری خاک کا سرمہ مری آنکھوں میں عزیز
یہ صبا کہتی ہے ہر صبح کو پروانے سے



جس شہر کی خاک تھے چھانے ہوئے
کیوں اُسی کے لوگ بیگانے ہوئے

نامناسب تھا محبت کا چلن
جن کو اپنایا وہ انجانے ہوئے

ہم کو چونکایا بہت لہجھا کیا
ہم تو تھے کچھ اور ہی جانے ہوئے

جال پھیلائے ہوئے ہیں راہ زن
قافلے منزل کی ہیں ٹھانے ہوئے

ساری مستی ہے ہماری ، آپ کی
مفت میں بدنام میخانے ہوئے

شمع کو محسوس تک نہ ہوسکا
اس طرح خاموش پروانے ہوئے

جن احباب ، انجانے عزیز
سب کے سب ہیں جانے پہچانے ہوئے



نہ اپنی سدھ ہے نہ دنیا کا ہے خیال مجھے ”سنا رہا ہے کوئی مُردہٴ وصال مجھے“
 جہاں سے پست نظر آئے کوئی بامِ عروج اب اُس اُڑان پہ پہنچا گیا زوال مجھے
 خبر کسی کو نہ ہو، مجھ کو بھی ملال نہ ہو نکالنا ہو تو محفل سے یوں نکال مجھے
 یہ کس مقام پہ لیا ہے مجھ کو میرا جنوں میں پل صراط پہ ہوں اُئے خرد سبجال مجھے
 زمیں پہ آج جو ٹپکا ہے یسینہ میرا تسلی دیتا ہے چھوٹا سا اک دوال مجھے
 مرے قریب سے ہو کر گزر گئی ہے قضاء دُنائیں ماں کی بچالی ہیں بال بال مجھے
 وہ لڑ رہا ہے زمانے سے میرے حق کیلئے بچا کے خود کو نظر سے، بنا کے ڈھال مجھے

دیارِ غیر میں ہجرت ہے اک عذابِ عزیز

اب ایک لمحہ بھی لگتا ہے ایک سال مجھے



تسلیموں کے شگفتہ گلاب رکھدینا
 اِن اندھی آنکھوں میں اُن دیکھے خواب رکھدینا
 فلک پہ اُڑنے سے نزدیک کب ہوئی دُنیا
 قدم زمین پہ اپنی شتاب رکھدینا
 کھلا تو رکھنیے ذرا ہاتھ کم سے کم اپنا
 کٹھن اگر ہے کھلا دل کا باب رکھدینا
 سلگ رہا ہے سمندر پہ وقت کا سورج
 جو ہو سکے تو اِسے زیر آب رکھدینا
 حبابِ زیست ہے جب کائنات پر حاوی
 تو اس کا نام بھی اب آفتاب رکھدینا
 نظر ہے حسن و زور و مالِ جہاں پر سب کی
 اب اِس کے رُخ پہ خدایا نقاب رکھدینا
 اذل سے ہی تو رہا ہے یہ شیوہ آدم
 حقیقتوں کے مقابل سراب رکھدینا
 وجودِ دل کو کوئی جب جھنجھوڑ کر رکھدے
 خدا کے حکم پہ اُسکا حساب رکھدینا
 کرم نہیں ہے ترا یہ تو کیا ہے ، ہم سب پر
 بقدرِ ظرفِ عذاب و ثواب رکھدینا
 نظر بھی دنیا اِن آنکھوں کو دید حق کیلئے
 پھر اُس میں نورِ حقیقت کی تاب رکھدینا
 اُٹھا کے شانوں پہ پھرتے رہے ہو جس کو عزیز
 زمیں پہ اب وہ جنازہ جناب رکھدینا



حوصلہ گردشِ لَیام سے برتر رکھنا
 اک دیا چھوٹا سا طوفان کی زد پر رکھنا
 سُوکھ جائے نہ زمیں دل کی یوں گھٹتے ، گھٹتے
 اپنے اشکوں کی نمی دے کرات تر رکھنا
 گتھیاں اپنی لٹیں کھول کے رکھ دیں خود ہی
 یوں تدبیر کو نگاہوں میں اُجاگر رکھنا
 اس اندھیرے کے تسلسل سے نہ پتھرا جائیں
 بند آنکھوں کے مقابل کوئی منظر رکھنا
 اک سلگتے ہوئے سنگلاخ جزیرے کی طرح
 ”بوند آنکھوں میں نہیں دس میں سمندر رکھنا“
 اپنی بستی میں ہیں ہر سمت مکاں شیشے کے
 کتنا دُشوار ہے اب ہاتھ میں پتھر رکھنا
 ہم لے مائے کہ یہ مقصد ہے ضروری ، پھر بھی
 آستینوں میں نہیں ہاتھ میں خنجر رکھنا
 دل جہاں پر بھی جھکا چوٹ ہی کھائی اکثر
 اب کسی درپہ یہ سر سوچ سمجھ کر رکھنا
 دھوپ اور چھاؤں کے قبضے میں ہے دنیا ساری
 گھر کی بنیاد کو ایسے میں کہاں پر رکھنا ؟
 روشنی بانٹ کے بستی کے چراغوں میں عزیز
 گھر و دنیا کے اندھیرے سے مُنور رکھنا



نظم دریا کا کسی جھیل پہ لا دا نہ کریں
 یہ دبستاں ہے یہاں شور مچایا نہ کریں
 آپ حق پر ہی سہی شیخ کو ٹوکا نہ کریں
 خود کو اس طرح زمانے میں اکیلا نہ کریں
 مصلحت کہتی ہے خاموش رہیں اور دیکھیں
 دل یہ کہتا ہے حقیقت کو چھپایا نہ کریں
 خدمتِ خلق میں پنہاں ہیں مفادات کئی
 رہ نما کیسے اسی شاخ پہ تکیہ نہ کریں ؟ !
 بستیوں پر بھی سمندر کا تصرف ہے میاں !
 گھر میں طوفان ہے سمندر میں ٹھکانہ نہ کریں
 تلخیاں پڑھ کے یہ سوئے ہیں زمانے بھر کی
 اس طرح نیند سے بچوں کو جگایا نہ کریں
 گھر کے افراد بھی پوچھیں نہ کہیں نام و پتہ
 کھوئے کھوئے سے یوں دہلیز پہ ٹھہرا نہ کریں
 اڑ گیا وقت بھی ہاتھوں سے حنا کی مانند
 ہتھیلی کی لکیروں کو کریدا نہ کریں
 موتیاں رول کے ہر زخم کی رکھ لیں دل میں
 شرط یہ بھی ہے کہ ساحل کو بھگویا نہ کریں
 دھوپ ہی دھوپ ہے راہوں میں نہیں پیڑ غریب
 اب کسی موڑ پہ رکنے کا ارادہ نہ کریں



چرندوں کی نگاہوں میں خس و خاشاک ہے دنیا
مگر شاہیں کے حق میں منبعِ افلاک ہے دنیا

مدبر کیلئے اک درس ہے فطرت کا ہر منظر
وسیع ہو گر نظر تو حاصلِ ادراک ہے دنیا

کوئی گر دیکھنا چاہے اسے لیلے کی نظروں سے
کسی مجنوں کے دامن کی طرح صد چاک ہے دنیا

مقامِ درسِ عبرت بھی ہے ، عزت بھی ہے ، شہرت بھی
دیارِ مفلسی میں مسکنِ املاک ہے دنیا

تو نگر کی نظر میں مخزنِ معدن ہے یہ لیکن
قلندر کیلئے بس ایک مُشتِ خاک ہے دنیا

تنِ ناپاک کی مانند ہے یہ بھی غلاظت میں
اگر دل پاک ہو تو آپ ہی خودِ پاک ہے دنیا

اسے ناقص سمجھنے کی جسارت کر نہیں سکتے
مقامِ حمد ہے ، بزمِ شہرہِ لولاک ہے دنیا

جو سمجھو گے سو پاؤ گے جو بوؤ گے سو کاٹو گے
عمل جیسا ہے پھل دیا ، بڑی بیباک ہے دنیا

عزیزِ اہل وفا کے واسطے یہ ماں کی صورت ہے
مگر سفاک لوگوں کیلئے سفاک ہے دنیا



وقت یہ کہتا ہے کہ مجنوں کو ہی دانا کہو
 رند، کسینے گا اُسی کو جس کا خالی جام ہو
 مہکدہ کس موڑ پر ہے اور ہے، اب ساقی کہاں
 فصلِ گل میں بھی جہاں سب پھول ہوں بے رنگ و بو
 ہوش کی جو بات کہتا ہے تو دیوانہ کہو
 مئے جہاں ملتی نہیں ہے اُس کو میخانہ کہو
 اُس چمن کو بھی چمن کہتے ہو، ویرانہ کہو!
 اب کوئی اپنا دکھائی دے تو بیگانہ کہو
 پیار کی خوشبو دلوں سے لے اڑی رُتِ پیار کی
 آندھیاں جب پھونک دیں گی بستیوں کی بستیاں
 خاک کو بسترِ گذر گاہوں کو کاشانہ کہو
 دستکیں دیتی ہیں کب سے خوف کی پرچھائیاں
 کب سے اُنکا منتظر ہوں، شوق سے آنا کہو
 یہ سسکتی آہِ دل کی، یہ چھلکتے اشکِ غم
 لینے والا کون ہے اب ایسا نذرانہ کہو

آگ میں جلنے کی حسرت ہو نہ ہو لیکن عزیز

پر نکل آئے ہوں جس کے اُسکو پروانہ کہو



دکھاوے کی یہ شہرت اور جھوٹی شان رہنے دے
جہاں حیرت کدہ ہے ، تو ہمیں حیران رہنے دے

کٹھن اس دور میں ہے نیک و بد کا فرق سمجھنا
سمجھتے ہیں بہت کچھ پر ہمیں اتجان رہنے دے

نفاذِ امن کی تدبیر ہے اک سعی لا حاصل
اگر بستی میں ہے برپا کوئی بحران رہنے دے

نہیں ہے کچھ اُمید چارہ سازی نیم جانوں سے
جو دل میں ہے ترے موجود وہ امکان رہنے دے

مشقت کی بہت اس دشت کو گلزار کرنے کی
یہ ویرانہ ہی تھی دنیا ، اسے ویران رہنے دے

جو کابل ہیں اُنہیں اے وقت رہنے دے مکانوں میں
مگر ہم شہسواروں کو سر میدان رہنے دے

وجودِ گلستاں سے جو کبھی رشتہ نہیں رکھتے
سجا کر گھر میں رکھتے ہیں وہی گلدان ، رہنے دے

ہمیں جھوٹی تسلی دے کے بہلانے سے کیا حاصل
دلِ افسردہ خاطر میں جو ہیں ارمان رہنے دے

پڑا رہنے دے ہم کو اے عزیز اب ساکت و صامت
رہا کرتا ہے گھر میں جس طرح سامان رہنے دے



زندگی صرف تری حسرت املاک میں ہے
 پتہ خبر بھی ہے تجھے موت تیری تاک میں ہے
 پوچھتا کیوں ہے کہیں آنکھ کا اندھا تو نہیں
 ساری روداد میرے دیدہ نمناک میں ہے
 آتش و آب و ہوا بھی ہیں مرے جزو بدن
 ان میں کچھ بات نہیں، بات مری خاک میں ہے
 عقل اب تیرا فریضہ ہے پرکھنا اُس کو
 خاک کا پتلا ہے پر آتش پوشاک میں ہے
 وہ ستارے جو تری چشمِ فسوں سے تھے گرے
 اُن کی وقعت تو مرے دامنِ صد چاک میں ہے
 مجتمع سارے سمندر کی کثافت ہے جہاں
 دُرِ نایاب اُسی ساحلِ ناپاک میں ہے
 اک نظر پڑتے ہی کھل جاتے ہیں اسرارِ سبھی
 کیا غضبناک اثر دیدہ میباک میں ہے
 میرا مشہود ہے وہ لاکھ تخیل ہی سہی
 مجھ سے اوجھل ہے مگر وہ مرے ادراک میں ہے
 دھوکے رکھ دیتی ہے ہر ایک کثافت کو عزیز
 بہتے پانی سی لطافتِ نگہ پاک میں ہے



یہ کس نے کہدیا کہ مُنَوّر نہیں ہیں ہم
کیا ظلمتوں میں نُور کا پیکر نہیں ہیں ہم

یہ اور بات ہے کہ ٹھہرتی نہیں نظر
صرفِ نظر ہو جس سے وہ منظر نہیں ہم

اس لفظ ”میں“ نے ہم کو صفاتی بنادیا
ورنہ حصارِ ذات سے باہر نہیں ہیں ہم

گستاخیوں سے ہی تو سلجھتی ہیں گتھیاں
پر انکشافِ راز کے خوگر نہیں ہیں ہم

مانا کہ مُشتِ خاک ہیں ، ذرّہ ہیں ، گرد ہیں
یہ بھی تو سچ نہیں ہے کہ جوہر نہیں ہیں ہم

وہ سنگ ہیں کہ جس پہ عمارت کا بوجھ ہے
یاد کسی کے ہاتھ کا پتھر نہیں ہیں ہم

تنہا سمجھ کے ہم کو نہ لشکر سے کر جدا
یا یہ بتا کہ شاملِ لشکر نہیں ہیں ہم

حُسنِ خیال و فکرِ مُصَوّر ہیں ہم عزیز
جو اپنے آپ بن گیا وہ گھر نہیں ہیں ہم



خاکساری کرتے کرتے خار گھنگھرو بن گئے
 خوشہ چیں بھی لیجئے دہقان ساہو بن گئے
 رات کی تاریکیوں کا ہمسفر کوئی نہ تھا
 اک ندا آتے ہی ذرے اڑ کے جگنو بن گئے
 اپنی ہستی کو مٹا کر جس نے بخشی تھی حیات
 پی کے اُس مٹی کا خوں کانٹے بھی گلرو بن گئے
 وقت کے تیور بدلتے ہی اثر دل پر ہوا
 ترجمان خود حالتِ دل کے یہ ابرو بن گئے
 پھول غنچے اور ہوا سب خوش پیامی کے لئے
 گلستاں میں ہر طرف سامانِ خوشبو بن گئے
 آتشِ برق و شرر سے تیز ہے وہ شعلہ رو
 شام کے سائے سمٹ کر جس کے گیسو بن گئے
 سحرِ فتنہ گر جہاں میں جب نمایاں ہو گیا
 زندگی کے مرحلے سر چڑھتا جادو بن گئے
 دل مرا زخموں سے ہو کر چور جب ساکت ہوا
 خون کے قطرے ترے خنجر کے آنسو بن گئے
 اک شعاعِ شمس ہی تھی صبحِ کاذب کا سبب
 جب اندھیرے کا شفقِ اسرارِ شب رو بن گئے
 مجرم پر اکسا کے اندھے کو مقید کر لیا
 پھر جہاں دیدہ مگر کے خود ترازو بن گئے
 خاکِ فانی میں فقط ظرفِ مکاں کا کھیل تھا
 ہم برائے نطقِ ذاتی سب من و تو بن گئے
 حسنِ کامل کی کشش کا یہ اثر ہے اے عزیز
 سارے ضیغم عاشقانِ چشمِ آہو بن گئے



یہ نشیبی راہ ہے دھیمی ذرا رفتار کر
 جب ہو اُونچائی مقابل جوش کا اظہار کر
 دُوبتے سورج پہ چبھتی آنکھ سے مت وار کر
 جب سوا نیزے پہ آجائے تو آنکھیں چار کر
 حوصلہ ہی جوہر واحد ہے جینے کے لیے
 موت کو دعوت نہ دے یوں زندگی سے ہار کر
 زندگی اک مرحلہ ، اک کرب ، اک مشکل سہی
 سب اسے آسان کریں گے تو اسے دشوار کر
 اک تدبیر ہی ترا کافی ہے تیرے واسطے
 اس لچکتی پھول کی ٹہنی ہی کو تلوار کر
 یہ دل مضطر ہی تو ہے اک تیرا رختِ سفر
 روشنی ذوقِ نظر کی دے اسے ہموار کر
 تھام لے پتوار کو دستِ خرد آموز میں
 پھیر کر ہر موج کے رخ کو سرِ منجدھار کر
 فکر کی پرواز کو لازم نہیں ہے آسماں
 سرنگوں ہو جا ذرا پھر عرش کا دیدار کر
 تلخی حق کب اُترتی ہے گلے سے یہ تو کہہ
 لب کشائی پر مری پھر شوق سے اصرار کر
 سربلندی فقر کی پستی میں پنہاں ہے عزیز
 اس طرح مختار بن پھر دل کو خود مختار کر



جو کلیاں زینتِ گلشن تھیں خاص و عام کی خاطر
سجائے ہو انہیں بازار میں نیلام کی خاطر

وَقُوْرِ انبساطِ عارضی کچھ دیر سونے دے
صبح ہوتے ہی کرنی ہے غم و آلام کی خاطر

برائے رنگ و بو پیسا گیا صدیوں تلک مجھ کو
حنا کہہ کر پکارا تب مجھے کچھ کام کی خاطر

بقائے صبح کی خاطر کبھی شعلے اُگلتا ہوں
کبھی چپ سادھ لیتا ہوں سکوتِ شام کی خاطر

بنایا تھا دل و جاں سے جسے پیکرِ محبت کا
اُسی کو چُن لیا پھر کس لیے دشنام کی خاطر!

بنامِ عشق جو آتش ہے پنہاں میری فطرت میں
ابد تک ہوں میں سجدے میں اُسی الزام کی خاطر

لگا رکھی ہے اک آندھی مرے پیچھے زمانے سے
سجا رکھا ہے اک گلزار بھی اکرام کی خاطر

اندھیرا شام کا جس کا مقدر تھا ، وہی جگنو
فضا میں ہو گیا روشن بقائے شام کی خاطر

مُھْوَلِ زن ، زمیں ، زر کیلئے بدنام ہے دنیا
عزیزِ اک تم ہو کہ مر مٹ رہے ہو نام کی خاطر



اے مسیحا نئے حکمت کا حاصل اور ہے جو مریض دل کو لاحق ہے وہ مشکل اور ہے
 بڑھ رہے ہیں پاؤں جس جانب وہ رستہ اور ہے دل نے جس منزل کی ٹھانی ہے وہ منزل اور ہے
 اور ہی کچھ ہے نظارہ میرے دل کے روبرو منظر دنیا نگاہوں کے مقابلہ اور ہے
 اور ہے وہ دل اٹھا کر دیدیا جو یار کو جو دھڑکتا ہے مرے سینے میں وہ دل اور ہے
 آپ اپنے قتل کی سازش میں خود شامل تھامیں جس کو ٹھہرایا ہے منصف نے وہ قاتل اور ہے
 دین بھی تیرا ہے زاہد اور دنیا بھی تری میری رسوائی کے غم میں غم یہ شامل اور ہے
 میں تو اتر ونگا بھنور میں ، تو کنارے پر اتر تیرا ساحل اور ہے اور میرا ساحل اور ہے
 اب کسے میں دل کہوں آخر کسے دھڑکن کہوں غیر ممکن ہے کہ دھڑکن اور ہے ، دل اور ہے
 یاں اُجالا ہی اُجالا ہے چراغوں کے بغیر خاکسار ان درِ یزداں کی محفل اور ہے

آج تک گھلتا نہیں یہ راز کیوں ہم پر عزیز

بور تھا منشاء تو کیوں یہ رنگِ محفل اور ہے !؟



یہ مت پوچھو کہ کوہِ طور ہے کیا
 تھیں جلنا کہو منظور ہے کیا
 دوئی کیا ہے نہ پوچھو ، یہ بتاؤ
 رگِ جاں بھی ہماری دور ہے کیا
 انا الحق کہنے والے کچھ خبر ہے
 مآلِ جرأتِ منصور ہے کیا
 شعاعِ شمس ہی خود منعکس ہے
 نظر کیا ہے ، جمالِ حور ہے کیا
 نظر آنا ، رجھانا ، منہ مچھپانا
 محبت کا یہی دستور ہے کیا
 یہ سوزِ عشق یہ زخمِ محبت
 تے کہتے ہیں سب ناسور ہے کیا
 پگھل جاتی ہے شمعِ موم بن کر
 یہ مَدوانہ جو ہے کافور ہے کیا
 وصال و ہجر کا یہ کھیل سارا
 مجازی آنکھ کا مذکور ہے کیا
 اُجالا اپنی فطرت سے ہے عاجز
 اندھیرا اس لئے مغرور ہے کیا
 بچوں کیوں بڑھ گیا ہے حد سے آگے
 خردِ اس باب میں مجبور ہے کیا
 فریبِ آگہی اتنا بتادے
 صفات و ذات میں مستور ہے کیا
 مجھے کیوں ہو مآلِ زیست کا غم
 خدا جانے اُسے منظور ہے کیا
 سمندر میں عزیز اپنے کو ڈھونڈے
 کہو قطرے کا یہ مقدور ہے کیا



میں بھی فانی، تو بھی فانی، اور باقی کچھ نہیں
 ماسوا جو کچھ یہاں ہے اک خدا کی ذات کے
 کلمہ حق میں جو ”لا“ ہے اس کا معنی ہے ”نہیں“
 حاصل مثبت و منفی کیا ہے، منفی کے سوا
 ان ہتھیلی کی کیردس کے علاوہ ہاتھ میں
 ایک چھوٹی سا خطا کا اک فسانہ بن گیا
 جس کا سنا ہو یقینی اُس کو ہستی کیا کہیں
 اصل خاکی خاک ہے اُسے حسنِ فطرت کے اسیر
 شکل و صورت، عادت و خصلت مجازی ہیں مگر
 یہ صفاتی آنکھ ہے اور وہ تجلی ذات کی
 ہے من و تو یا انا کی گفتگو بیکار کی
 ذات اُس کی مظہر آرائشِ حسنِ خودی
 اک خدا کی ذات باقی اور باقی کچھ نہیں
 ہے فریبِ زندگانی اور باقی کچھ نہیں
 اس ”نہیں“ میں سب ہے مخفی اور باقی کچھ نہیں
 مثبت و مثبت ہے باقی اور باقی کچھ نہیں
 ایک پیمانہ ہے خالی اور باقی کچھ نہیں
 وہ خطا تھی ابتداء کی اور باقی کچھ نہیں
 نیستی ہے یعنی ہستی اور باقی کچھ نہیں
 یہ سراپا تو ہے فرض اور باقی کچھ نہیں
 اُس کا پس منظر حقیقی اور باقی کچھ نہیں
 دید بوسی لن ترانی اور باقی کچھ نہیں
 سب سے اچھی ہے خموشی اور باقی کچھ نہیں
 عشق اُسکا وصفِ ذاتی اور باقی کچھ نہیں

”میں“ کا یہ لفظ اضافی درمیاں ہے اے عزیز

”وہ“ ہے مثبت ”میں“ ہے منفی اور باقی کچھ نہیں



محافظ ہے ، سہارا ہے ، بجا ہے
 مگر دیوارِ بے در ہے تو کیا ہے ؟
 مر۔ عیبوں پہ پتھر پھینکتا ہے
 وہ پھر بھی آئینے کا آئینہ ہے
 خبر ہے سب کو آگے ہے توقع
 قضا پیچھے یہ کس کو پتہ ہے
 حسدے ماخِر و شر کے پیش و پس میں
 تری تقدیر ہے یہ اور کیا ہے
 بناتا جا گھروندے ساحلوں پر
 غرورِ موج کو گر توڑتا ہے
 سراپوں کو حقیقت میں بدل دے
 اگر دل میں ترے کچھ ولولہ ہے
 بکھرنا ہے بکھر جانے دے اس کو
 شکستہ آئینہ کیوں جوڑتا ہے
 قلندر ہے تو جا اپنی گھپا میں
 سر بازار کیوں بیٹھا ہوا ہے
 دھڑکنا ہے تجھے اس دل کی مانند
 یہی تو زندگی کا فیصلہ ہے
 حقیقت اپنی فطرت سے ہے کڑوی
 حیاتِ بے مزہ ہی میں مزہ ہے
 سمجھداری ہے اپنی حد میں رہنا
 گذر جاؤ جو حد سے تو خلاء ہے
 عزیز ہو جا خودی سے اپنے بے خود
 اسی میں عافیت ہے اور بقاء ہے



یہ دنیا اک کھلونا ہے ، خدا ہے
یہ اپنا ہی تماشا ہے ، خدا ہے

مکاں سے لا مکاں تک اُسکی تُوٹی
اُسی کا بول بالا ہے ، خدا ہے

شروع سے آخری تک اُسکا قصہ
اُسی کا ہر زمانہ ہے ، خدا ہے

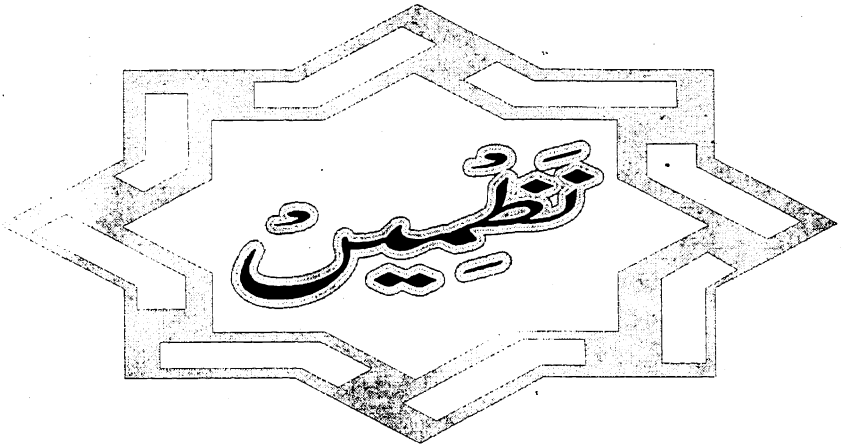
فقط یہ مَن سے مَن کی گفتگو ہے
مَن و تُو اک بہانہ ہے ، خدا ہے

وجود زیت ہے اللہ ہی اللہ
عدم تو ھوکا سایہ ہے ، خدا ہے

صفات و ذات کی تقسیم کیسی
اُسی کا یہ سراپا ہے ، خدا ہے

تجلی کی تمنا اس لئے ہے
نظر ہے ، دل ہے ، شیشہ ہے ، خدا ہے

عزیز اچھی نہیں تحقیق حق کی
یہی اک کام اچھا ہے ، خدا ہے



شاعر نامہ

یہ وہ فن ہے جس کا حاصل کچھ نہیں جز نام بس
شاعری بھی ہے حدیثِ مسلک الہام بس
پر مثالِ آبیاری لبو بے دام بس!
جانے کتنی عرق ریزی کا ہے یہ انجام بس
اور صلہ اس آئینہ سازی کا ہے دشنام بس
کیا جواب شکوہ شاعر سے ہیں وہ رام بس
کچھ مدح سرائی تو ملیں گے دام بس
وہ ستارے ہیں زمیں پر لقمہ آلام بس
اور صلہ خونا ب پر تیزابی آلام بس
زندگی بھر تھے وہی معتب و بے آرام بس
بن گئی مسکن دیارِ غیر میں اک شام بس
شاعری ردی کی قیمت ہو گئی نیلام بس
خلعت و اکرام ہیں یہ تہمت و الزام بس
حافظ و سعدی ، دروہی ، جامی و خیام بس
دارغ و سودا ، آتش و تابش و اک الہام بس
نوحہ انیس و میکش ، وجد کا انجام بس
قیسی و محمود ، اریب و شاذ تشنہ کام بس
مجھ کو یہ ڈر ہے کہ ہو جائے نہ قضا عام بس
فعل یہ اختر شاری کا ہے اک اقدام بس
گل بہ دیدہ ، گل بہ دلاں ، گل بہ دل ، گلہام بس
مظر دنیا ہے اپنے حق میں خون آشام بس

شاعری ہے درسِ عبرت ، درد کا پیغام بس
شاعری ہے آیتِ احساس و لہجہ و شک و تر
شاعری ہے اک پیام و دعوتِ فکر و نظر
جانے کتنے رت جگوں کا ما حاصل ہے یہ کلام
ہو گئے مجروح ذہن و دل بصیرت کے سبب
شکوہ شاعر پہ کیوں اٹھتی ہیں سب کی انگلیاں
شاعروں کی مفلسی سے اہل زر کا یہ مذاق
تھے فلک کی گود میں لیکن گرے سب ٹوٹ کر
غالب خستہ کا وہ پختہ کلام خونچکاں
شاعر مشرق کو کبھی قوم تو بعد از وفات
یوں تو فانی نے کیا تھا صبح کی خاطر سفر
ہو گیا یکا دتہنا شاعر خستہ جگر
سادہ لوحوں کی جمیعت اور یہ شانوں پر صلیب
شاعری میں میر و غالب ، حالی و اقبال و درد
فانی و حسرت و شبلی ، مومن و ذوق و ظفر
اصغر و ساعر ، جگر ، یگانہ و فیض و فراق
سائر و کبھی ، علی سردار ، مجروح و شکیل
شاعرانِ حال کی بابت اگر میں کچھ کہوں
کتنے انجم سے سچی ہے محفلِ شعر و ادب
گلشنِ شعر و سخن کے سب گلوں کا حال ایک
اتنی پیاری بستی آدم وہ یہ تلخاب سا

من کے یہ شکوہ کہا غالب نے اے ہر دل عزیز
بس خدا را یہ فعل اے عندلیبِ خام بس

مرحوم ساحر لدھیانوی کی نظم ”تاج محل“ پر ایک مخالف تاثر

”جمنّا کے کنارے — تاج“

آنجل کو سلیقے سے ذرا سر پہ سجا کر
آدابِ وفا حُسنِ عقیدت سے ادا کر
منظور ہو تجھ کو بھی اگر پاک محبت
جمنّا کے کنارے مری محبوبِ بلا کر

یہ مَر مریں مینار کہ محبوب کی باہیں
پانی ہیں جنہیں دیکھ کے تسکین نگاہیں
ہے جس کی نزاکت پہ حسینوں کو تعجب
اُس صنعت نازک کو بھلا کیوں نہ سراہیں

وہ دُودھ چادر میں سمٹی ہوئی دُلہن
یا، پی کیلئے سوگ میں بیٹھتی ہوئی برہن
یا جیسے کوئی ماہِ جبیں آبِ جمن میں
اتری ہو بصدِ شرم و حیا کھینچ کے چلن

خود حُسن بھی و حُسن کی تصویر ہے یہ تاج
اک جتوئے عشق کی تصویر ہے یہ تاج
معمار نہیں صاحبِ ادراک تھے وہ لوگ
اُن سب کے حسین خواب کی تعبیر ہے یہ تاج

ہے پاسِ وفا جن کو یہاں آتے ہیں وہ لوگ
احساس ہے تو درسِ وفا پاتے ہیں وہ لوگ
اور جن کو نہیں پاسِ وفا، پاسِ مراتب
توہینِ شہنشاہ پہ آجاتے ہیں وہ لوگ

یہ جاہ و حشم ، شان و شوکت ہو کہ سطوت
 رغبت نہیں رکھتی کبھی دولت سے محبت
 یہ دولت و کثمت ہیں عنایاتِ الہی
 کیوں حکمتِ قدرت پہ ہے انسان کو حیرت

یہ نمن و قمر ، انجم و مریخ و زحل سے
 نیز گلی دنیا ہے فقط رنگ و نسل سے
 غربت ہو ، امارت ہو کہ پستی و بلندی
 نافذ ہے یہ قانون یہاں روزِ ازل سے

اس تاج سے ہٹ کر بھی کبھی چشمِ سُخور
 کیا تو نے نہیں دیکھے وہ صنّاعِ کے مظهر
 پُر شکوہ قلعے ، شہر و باغات و مساجد
 بنتے ہیں جنھیں دیکھ کے مفلس بھی تو مگر

نسبت ہی نہیں عشق کو کچھ شاہ و گدا سے
 یہ رتبہ تو عطیہ ہے جو ملتا ہے خدا سے
 یہ تاج شہنشاہ نے جس وقت بنایا
 منشاء نہ تھا کھیلے وہ غریبوں کی وفا سے

تو اپنی بھی آنکھوں میں کوئی خواب سجا کر
 نظریں اٹھا عزیز مگر آنکھ مجھکا کر
 یاں سوتے ہیں دو پیار کی قدروں کے محافظ
 اس راہ سے گزرے ہے صبا پاؤں دبا کر

جمنّا کہ کنارے مری محبوب ملا کر

(بہ ضمن انتخاباتِ حلقہ ارباب ذوق، جدہ، سعودی عرب) اپریل ۱۹۹۳ء

”مبارکباد“

ہیں شبِ گزیدہ تو کیا ہوا کہ عزیز تر ہے سحر پرستی
کہ خود پرستی و بُت پرستی کے دُور میں ہو نظر پرستی
وَقَار، بیکس، خَلشِ مبارک، جمیل اور اعتمادِ بَارک
کہ دی ہے تم رہبروں کو ہم نے یہ بزمِ اُردو کی سر پرستی

عزیز ہو تم تو ہر کسی کے، تمھاری اُلفت کو کیا پرکھنا
سلیم ہو تم عظیم شاعر تمھاری رفعت کو کیا پرکھنا
معین کی کیا مثال دینا، رشید کی کیا نظیر دینا
جو قدرِ مہتاب بڑھ گئی ہے تو اُسکی عظمت کو کیا پرکھنا

خلیل و آعظم، غنی و عابدِ سخن شاسوں کو پھر پکارو
یہ کہدو مصعب سے انجمن میں گئی بہاروں کو پھر پکارو
چمک اُٹھے ہیں حسین اُردو کی مانگ میں کچھ نئے ستارے
جو چھپ کے بیٹھے ہیں بادلوں میں تم ان ستاروں کو پھر پکارو

تمام ارکان و عہدہ داروں میں ولولہ ہو تمہار جیسا
ادیب، شاعر و ناقدوں میں ہو ربطِ باہم ستار جیسا
یہ وقت ہے بس یکاگت کا، مشاورت کا، مصلحت کا
حسین بزمِ ادب کے رُخ پہ ہے کیوں یہ گرد و غبار جیسا

جو اہل اُردو ہیں اُن کی خدمت میں کاش پہنچے سلام اُردو
خدا کرے کہ ہو جذبِ اُنکے دلوں میں پھر سے پیامِ اُردو
ہمارے دل میں ہی دَفن ہوگا ہماری تہذیب کا آئنا
نئی نسل تک اگر نہ پہنچے نظامِ اُردو، کلامِ اُردو

”نیا سال“

بلا جیسے ٹلا کرتی ہے سر سے
 ابھی کچھ دیر پہلے ہی ٹلا ہے
 پُرانا سال دیوانوں کے سر سے
 اُدھورے خواب پلکوں پر سجا کر
 تھیں تصویر مایوسی بنا کر!

ابھی کچھ دیر گزری آچکا ہے
 یہ سال نو
 نئے اوہام لیکر
 مُصیبت ہے کہ راحت
 کیا خبر ہے
 نویدِ عید ہے کہ
 شامتِ غم
 کسی سے کیا کہیں
 مَبہوت ہیں ہم
 مَبارِ کُباد کے خطِ آرہے ہیں
 دِلا سہ دے کے یہ سمجھا رہے ہیں
 تھیں کو کیوں یہ اندیشہ لگا ہے
 تماشا جو بھی ہو گا دیکھنا ہے

یہ کڑوے گھونٹ ہی تو پی رہی ہے
 توقع پر یہ دُنیا جی رہی ہے.....

”ایک آس“^{۹۹}

گھر سے ہر روز نکلتا ہوں میں اک آس لینے
 دل میں اک فتح کا احساس لینے
 بھوک کی ہوک ، ضرورت کی کھک
 ادھ مرے جسم کی تذلیل و ہتک
 ٹوکتے ہیں مجھے ہر روز کہ چل
 اس توقع پہ کہ
 امید کا سورج نکلے

گھر کی ویران سی دنیا میں اُجالا کرنے
 غم سے اُترے ہوئے چہروں پہ مسرت کی کرن
 ایسے پھوٹے کہ ہنسی چھن چھن کر
 بھیگی پلکوں سے ستارے چُن کر
 بے شمر گود شمر سے بھر دے

”عنتکبوت“

ہر گھر کے ہر کونے میں
 جال نیا بنتی رہتی ہے
 شام و سحر
 اپنی دھن میں اپنی خاطر
 ایک ٹھکانہ
 تار تار سے جوڑ رہی ہے
 دے کر اپنا خون جگر
 آنے والے کل کی خاطر
 آج کی راحت
 آج کا ہر سکھ چین گنوا کر

اُسکو کیا معلوم کہ کوئی
 اُسکو گھر کا میل سمجھ کر
 پل میں اس کے خواب کے جالے
 صاف کرے گا
 کون ہے اس دُنیا میں
 جو انصاف کرے گا.....!

”بادل دیکھ کے گھڑے پھوڑنا“

عصرِ حاضر
 بھول بھلیوں کا موسم ہے
 دنیا ہے ایک ریس کا میدان
 مکڑی کے جالے سے دل میں
 ارمانوں کا اک طوفان ہے
 دھول میں لپٹی ان سڑکوں پر
 ناکامی کی دھند ہے چھائی
 موت کو پیچھے چھوڑ کے پھر بھی
 دوڑ رہے ہیں اندھے سائے
 اپنی اپنی موت کے پیچھے
 بس ایک جھوٹی آس کا دامن
 تھام کے نکلے سب دیوانے
 کل کا سکھ پانے کی خاطر
 آج کا ہر سکھ چین گناتا
 اپنی عادت اپنی فطرت
 اپنے ہاتھوں سے خود اپنی
 قبر کھودتا

”بادل دیکھ کے گھڑے پھوڑنا“

”انتباہ“

آدمی عیب و ہنر ہیں مستند تیرے لیے
سارے دستاویز تیرے ہر سند تیرے لیے
ہیں قصیدے ہی قصیدے ہو اگر تو نیک خو
ورنہ یہ حرفِ ملامت ، لفظِ بد تیرے لیے

”جدت“

تھی ہم میں جتنی لیاقت نچوڑ دی ہم نے
لطفوں کی کثافت نچوڑ دی ہم نے
بس اطمینان بھری ایک سانس کی خاطر
تمام عمر کی راحت نچوڑ دی ہم نے

”آلودگی“

یہ مُردہ سن کے بوڑھا پیڑ اکثر مسکرایا ہے
شجر کاری کا جذبہ آندھیوں کے دل میں جاگا ہے

خُدیا گھٹ رہا ہے دم یہ مصنوعی ہواؤں سے
تمہارے کارخانے میں یہ کیسا کارخانہ ہے

عزیز اس کو ہماری بے بسی سمجھو کہ مجبوری
نہ چپ رہنے کی عادت ہے نہ کچھ کہنے کا یارا ہے

”کربِ تنہائی“

چھایا ہے فلک پر جو گھٹا ٹوپ اندھیرا
سورج کو لئے کاش نکل آئے سویرا

کچھ دیر سہی خود کو اُجالوں میں چھپالوں
کچھ دیر سہی شمس کی کرنوں میں نہالوں

کچھ دیر مجھے نور کے دھاروں میں بسادو
گلشن میں ، چمن زار میں ، پھولوں میں کھلادو

ہر شب کی سیاہی کا زہر مجھ میں بسا ہے
ہر رات نے ناگن کی طرح مجھ کو ڈسا ہے

یہ زیت اندھیروں میں بھلا کیسے گذاروں
مغرور اُجالو تمھیں کس طرح پکاروں

دیرانے میں رکھا ہوا میں ایک دیا ہوں
مجبور ہوں ، مایوس ہوں ، محروم ضیا ہوں

”کشفِ تنہائی“

تنِ تنہا مقدر کے ہزاروں سوگ جھپلا ہوں
عزیزو میں تمہارے ساتھ رہ کر بھی اکیلا ہوں

بظاہر نیک جذبوں کا بھی اظہار کرتے ہیں
مگر یہ جب بھی ملتے ہیں کوئی بیوپار کرتے ہیں
نہیں ہوتی کبھی بے لوث ان کی کوئی ہمدردی
یہ جب بھی بات کرتے ہیں تو پر اسرار کرتے ہیں

کھلونوں سے نہ پہلاؤ کہ ان سے خوب کھیلا ہوں
عزیزو میں تمہارے ساتھ رہ کر بھی اکیلا ہوں

یہ سچ ہے مجھ کو دستی ہیں مری تنہائیاں اکثر
گراں ہوتی ہیں میرے دل پہ بھی رسوائیاں اکثر
زمانے بھر کے غم دل میں چھپا کر مسکراتا ہوں
نظر آتی ہیں پھر بھی کرب کی پرچھائیاں اکثر

نئے نئے تماشائے سراپا غم کا میلا ہوں
عزیزو میں تمہارے ساتھ رہ کر بھی اکیلا ہوں

جہاں میں سخت ناممکن ہے پوری آرزو ہونا
ضروری تو نہیں ہر آدمی کا سُرخرو ہونا
یہ کیسا وقت آیا ہے خدایا آج دنیا میں
کہ اب لازم ہوا ہے بے سبب بے آبرو ہونا

جو ایسے وقت کے دھارے میں بہہ جائے وہ ریلا ہوں
عزیزو میں تمہارے ساتھ رہ کر بھی اکیلا ہوں

بڑا ہی لطف آتا ہے اکیلے دکھ اٹھانے میں
میں خوش ہوں اس خس و خاشاک کے تنہائی خانے میں
مجھے تنہائی کا طعنہ نہ دو اے انجمنِ دالو
مجھے معلوم ہے کوئی نہیں میرا زمانے میں

لیٹ جاتی ہے جو اپنی ہی شاخوں سے وہ بیلا ہوں
عزیزو میں تمہارے ساتھ رہ کر بھی اکیلا ہوں

اگست ۱۹۷۸ء میں فیملی کی سعودی عرب آمد پر۔۔۔ ایک تاثر

آہ جب تجھکو مری یاد میں بھرتے دیکھا بوجھ ہر درد کا سینے سے اترتے دیکھا
 جب ترے حسن کے جلوؤں کو نکھرتے دیکھا زلفِ ہستی کو پھر اک بار سنورتے دیکھا
 جل اٹھے ظلمتِ فرقت میں وصالوں کے چراغ دل کے صحرا میں ستاروں کو اترتے دیکھا
 کھل اٹھے جھیل سی آنکھوں میں مسرت کے کنول دل میں ڈوبے ہوئے جذبوں کو ابھرتے دیکھا
 تو ہے خاموش مگر شرم و حیا کی دیوی زلف و رخسار کو، سرگوشیاں کرتے دیکھا
 وصل کا خواب تو دیکھے ہوئے اک سن بیٹا آج تعبیر کو آنکھوں نے ابھرتے دیکھا
 جس کی تقدیر میں لکھا تھا فقط گرد و غبار اُسی صحرا سے بہاروں کو گذرتے دیکھا
 بات کل کی ہے جو کترا کے گذر جاتا تھا آج اُس وقت کو اس در پہ ٹھہرتے دیکھا
 اک سفینے کو کئی حسرت و ارمان لینے دل کے ویران جزیرے پہ اترتے دیکھا

وصل کی صبح کے آثار ابھرتے ہی عزیز

ہج کی شب کو دھندلوں میں بکھرتے دیکھا



ایک پیام۔۔۔۔۔ اصحابِ زر کے نام

پیامِ غم سُنا تا ہے مسرت آشنا ٹھہرو
نہ بھاگو وقت کے پیچھے ذرا ٹھہرو ذرا ٹھہرو

جنونِ شوق میں ہر فرض سے منہ موڑے جاتے ہو
یہ کیسی بُدھن ہے طاری کس لینے تم دوڑے جاتے ہو
ذرا مُڑ کر تو دیکھو گر پڑے ہیں ہمسفر کتنے
اندھیرے میں اُنھیں کس کے سہارے چھوڑے جاتے ہو
تمہیں انسانیت کا واسطہ اک ثانیہ ٹھہرو
نہ بھاگو وقت کے پیچھے ذرا ٹھہرو ذرا ٹھہرو

اندھیرا ان کی قسمت ہے یہ تاریکی میں رہتے ہیں
نظر ڈالو کبھی ان پر یہ بے چینی میں رہتے ہیں
سکونِ دل ہے ، خوش حالی میسر ہے تمہیں لیکن
مگر یہ وقت کے مارے تو بد حالی میں رہتے ہیں
سنائیں گے تمہیں بھی بے کسوں کا ماجرا ٹھہرو
نہ بھاگو وقت کے پیچھے ذرا ٹھہرو ذرا ٹھہرو

ضعیفی ، اُس پہ غربت کا یہ عالم دیکھتے جاؤ
یہاں ہر آنکھ ہے کس واسطے نم دیکھتے جاؤ
مسرت سے کبھی اپنی اگر فرصت ملے تم کو
یہ ٹھکرائے ہوئے لوگوں کا ماتم دیکھتے جاؤ
سفینہ ڈوب نہ جائے کہیں آئے ناخدا ٹھہرو
نہ بھاگو وقت کے پیچھے ذرا ٹھہرو ذرا ٹھہرو

بسائیں گے وہ گھر کیسے جو روٹی کو ترستے ہیں
 ہزاروں تم لٹاتے ہو یہ کوڑی کو ترستے ہیں
 یہ مڑجھایا ہوا جو بن یہ کھلائی ہوئی کلیاں
 ذرا دیکھو تو ان کے ہاتھ مہندی کو ترستے ہیں

ضروری ہے یہ غنچوں کیلئے آب و ہوا ٹھہرو
 نہ بھاگو وقت کے پیچھے ذرا ٹھہرو ذرا ٹھہرو

پتہ ہے میکشو تم کو کہ مستی کس کو کہتے ہیں
 خبر بھی ہے تمہیں آخر کہ ہستی کس کو کہتے ہیں
 تمہیں پرواز کی طاقت ہے اڑتے ہو فضاؤں میں
 بلندی سے مگر دیکھو کہ پستی کس کو کہتے ہیں

سُنا ہے آسمانوں میں نہیں ہوتی ہوا ٹھہرو
 نہ بھاگو وقت کے پیچھے ذرا ٹھہرو ذرا ٹھہرو

طریق بے نیازی چھوڑ کو مخلوط ہو جاؤ
 مٹا کر نقش ہائے بے رُخی مربوط ہو جاؤ
 سہارا دو خدا کے واسطے ان بے سہاروں کو
 دلوں کو جوڑ لو باہم ذرا مضبوط ہو جاؤ

ملے گا پھر تمہیں حق سے بھلائی کا صلہ ٹھہرو
 نہ بھاگو وقت کے پیچھے ذرا ٹھہرو ذرا ٹھہرو

تم ۔۔۔ ستم دن کو تو اک رات کرو ہو
 وہ دوست ہو دشمن کو بھی تم مات کرو ہو
 دامن پہ کہیں چھینٹ نہ خنجر پہ کہیں داغ
 تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

”تضمین“

شکوک ہے کہ ہم سے نہ کبھی بات کرو ہو
 تم غیر سے اظہار خیالات کرو ہو
 ہنس ہنس کے رقیبوں کو اشارات کرو ہو
 محفل میں عجب رنگ کے حالات کرو ہو

”تم ایک ستم دن کو تو اک رات کرو ہو

وہ دوست ہو دشمن کو بھی تم مات کرو ہو“

بھر بھر کے دے رہے ہو مجھے زہر کے لیاغ
 دل میرا داغ داغ ہے اور تم ہو باغ باغ
 کس کی مجال قتل کا الزام دے تمہیں
 ”دامن پہ کہیں چھینٹ نہ خنجر پہ کہیں داغ“

مُچھپ مُچھپ کے وہ بچ بچ کے سدا گھات کرو ہو

”تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو“

”ہمسایہ“

ہم سمجھے تھے ہمسائیہ کا مطلب
 سر پر اک سایہ
 دل کی دھڑکن ، آنکھ کی جوتی
 آتی جاتی سانس کا بندھن
 دکھ سکھ میں ہم شانہ ہوگا
 جان و مال کا حافظ لیکن
 تلخ حقیقت ایسی کب ہے
 اس کا تو کچھ اور ہی ڈھب ہے
 اس کی نیت اس کی فطرت اور خصلت ہے
 ڈر لگتا ہے
 پوشیدہ ہر راز ہے اس سے
 وہ تو اک دیوار کی مانند
 حائل ہے
 وہ تو چغلی اور غیبت پر مائل ہے
 رشک ، حسد کی آگ ہے دل میں
 آنکھوں میں نفرت کی جوالا
 موت کا سایہ جیسے سر پر رہتا ہے
 اپنے گھر میں سب رہتے ہیں
 وہ ہمسایہ سب کے سر پر رہتا ہے.....!

”خواہشوں کا سفر“

ذہن ہے اک وسیع بیکراں آسماں
 فکر و فن کی طرح دار اک انجمن
 حسن تصویر حسن مصور سے ہے
 ہر تصور مصور کی پہچان ہے
 آنکھ سورج ، نظر ہے کرن کی طرح
 ظلمتوں کو جلا بخشنے کیلئے
 دل سمندر دھڑکتی تمناؤں کا
 ہر لہر اک یقین ، ہر لہر اک گماں
 موج در موج ہم ہیں ، بھنور در بھنور
 بلبل : ہر اک بلبل نیا ایک خوف و خطر
 سانس در سانس ہے زندگی کا سفر
 لمحہ ہر لمحہ ہے موت بھی ہم سفر
 آن ہر آن کچھ کر گزرتے ہیں ہم
 روز جیتے ہیں ہم ، روز مرتے ہیں ہم
 خاک و خون میں ہے تر ہر نئی جستجو
 ابرِ آوارہ سی گیسوئے آرزو
 اپنے انجام سے بے خطر ، بے خبر
 دھوپ اور چھاؤں کا ہے یہ اندھا سفر

کچھ ملا بھی تو کیا مل گیا کیا کہیں
 کھو گیا بھی تو کیا کھو گیا کیا کہیں
 ڈھونڈتی ہے نظراک حقیقت مگر
 لوثتی ہے سراپوں کا سودا کینیے
 کچھ پشیمائیاں ، کچھ ہراسنائیاں
 اپنے دامن میں ان کے سوا کچھ نہیں
 سوچتا ہوں سفر میں میں شام و سحر
 منزل میں مل بھی جائیں تو کیا فائدہ
 کب سے جاری ہے یہ بیدلی کا سفر
 خواہشوں کی یہ خط ہے کہ رکتی نہیں
 کب سے کہتا ہوں میں
 علی حبیبؒ ، علی حبیب

۱۔ خط = (منی بس)
 ۲۔ علی حبیب = (بازو ہو جاؤ)

”منصوبہ“

زندگی لمبا سفر ہے
نت نئی راہوں سے ہو کر
جانب منزل رواں ہیں
قافلے

کوئی منصوبہ ضروری ہے سفر کے واسطے
منزل مقصود پانے کیلئے
ورنہ اندیشہ ہے بس اس بات کا
راہ ہستی میں بھٹک جائیں گے ہم
چلتے چلتے یو نہی تھک جائیں گے ہم.....

اُن ضعیف والدین کی نذر جن کے بچے باہر ممالک میں روزگاریا تعلیم کیلئے مقیم ہیں

” اُترے گا آسمان بھلا خاک پر کہاں “

اِس دور میں بچے خدمتِ مادر ، پدر کہاں
 نورِ نظر کدھر ہے وہ لختِ جگر کہاں
 فرزند ہے شکاگو میں ، دختر ریاض میں
 منزل کہاں پہ رہ گئی ، رَحمتِ سفر کہاں
 پرواز وہ تو کرتے ہیں تاروں کے ساتھ ساتھ
 اب ان میں ایسی طاقتِ پرواز و پر کہاں
 بویا تھا ایک بیج جو فردا کے واسطے
 وہ پیڑ بن گیا تو گرے ہیں ثمر کہاں
 تہائی کا یہ گھور اندھیرا ہے چار سو
 دیکھے گی اُجالوں کو یہ اندھی نظر کہاں
 تکتے کو گھر میں صرف یہ چھت ہی تو رہ گئی
 نکلے ہیں گھر کو چھوڑ کے دیوار و در کہاں
 آخر وہ تھک کے غم کے بچھونے پہ سو گئے
 خوابوں میں لیکے جائیگی یہ رہ گذر کہاں
 متا کہ تولتے ہیں وہ ڈالر کے ساتھ ساتھ
 بھوکے وفا کے رکھیں گے یہ مال و زر کہاں
 یہ سوچ کر وہ آخری تلخی بھی پی گئے
 ” اُترے گا آسمان بھلا خاک پر کہاں ! “

بو ظفر کی محبت سے لبریز تھی
 وہ صراحی نہ جانے کہاں رہ گئی
 قدر مہتاب کی گھٹ گئی آجکل
 سرفرازی نہ جانے کہاں رہ گئی
 اعتماد اب کہاں ہے کہ ٹیکس ہوں میں
 باوقارتی نہ جانے کہاں رہ گئی
 ہجر کی اک خلش ہے جگر میں مرے
 ہمرکابی نہ جانے کہاں رہ گئی
 بھائی عبداللہ ناظر کی شفقت بھری
 سرپرستی نہ جانے کہاں رہ گئی
 گونجی تھی جو سب کی بقاء کیلئے
 صوتِ سعدی نہ جانے کہاں رہ گئی
 وہ مدینے کی گلیاں وہ روضہ ہرا
 سبز جالی نہ جانے کہاں رہ گئی
 شہر مکہ ، وہ احرام ، اور وہ حرم
 سجدہ ریزی نہ جانے کہاں رہ گئی
 پھر اُسی فکر دنیا میں غلطان ہوں
 دینداری نہ جانے کہاں رہ گئی
 اے عزیز حق کی مرضی پہ ہے زندگی
 اپنی مرضی نہ جانے کہاں رہ گئی

”یاد ماضی“

بردباری نہ جانے کہاں رہ گئی
 خوش مزاجی نہ جانے کہاں رہ گئی
 روز و شب لا اُبالی کا عالم ہے اب
 ہوشیاری نہ جانے کہاں رہ گئی
 غم ہی غم ہیں کھڑے اب مرے روبرو
 شادمانی نہ جانے کہاں رہ گئی
 فول^۱ و حمص^۲ کی جا دال روٹی ہے پھر
 وہ سمہولی^۳ نہ جانے کہاں رہ گئی
 پھر رہا ہوں میں آٹو میں شام و سحر
 میری گاڑی نہ جانے کہاں رہ گئی
 تو بتادے ذرا اے نسیم سحر
 ”شام زلفی“ نہ جانے کہاں رہ گئی
 بھائی والد کی دل کو لکھاتی ہوئی
 بذلہ سنجی نہ جانے کہاں رہ گئی
 اب نہ راتنی رہے اور نہ منزل رہی
 شہسواری نہ جانے کہاں رہ گئی
 فتح و نصرت تھی، ناصر تھے، مسرور تھے
 تیغِ غازی نہ جانے کہاں رہ گئی
 ہاں وہ مہدی ظفر کی عنایت بھری
 میزبانی نہ جانے کہاں رہ گئی
 اب تہ جانے ہیں سجاد باہر کہاں
 فکر ان کی نہ جانے کہاں رہ گئی

”واپسی“

آدمی ہے چلتا پڑھتا
 ایک چیونٹی کی طرح
 حرکتِ پیہم میں ہے شام و سحر
 اپنی روزی ، اپنے فردا کیلئے
 زندگی تحریک ہے
 جستجو تحریک ہے
 آرزو تحریک ہے
 اپنے اپنے اشیاء سے
 سب رَحیلِ منزلِ ناکام ہیں
 کاوشوں کا ایک تسلسل
 جدتوں کی مشعلیں تھامے ہوئے
 ڈھونڈتے پھرتے ہیں دنیا میں
 سکونِ زندگی
 چھوڑ کر صحنِ چمن ، ارضِ وطن
 ہر متاعِ زندگی
 سانس جب تک ساتھ دے
 ہے جہاں تک دم میں دم
 سب کے سب گرم سفر ہیں
 پر کسی انجان سے اک موڑ پر
 ساتھ ان کا چھوڑ دیتی ہے یہ ہستی
 آرزو و جستجو
 اُسکے بعد اک دائمی منزل کی جانب
 ہیں رواں جس پر
 وہ رستہ ایک ہے
 واپسی.....

”منزلِ نامعلوم“

دن گذر جائے ہیں اور رات بھی کٹ جاتی ہے
 رنجشیں لاکھ سہی ، عمر بھی کٹ جائیگی
 جذبہء دل جو اگر تو نے مرا ساتھ دیا
 دل پہ چھائی ہوئی یہ دُھند بھی چھٹ جائیگی

نہ مسرت کی مسرت نہ مصیبت کا الم
 ہر طرف گھات میں ناکامی ہے ، رسوائی ہے
 کوئی طوفاں ہو کہ منجدھار مقابل میرے
 میں نے منزل پہ پہنچنے کی قسم کھائی ہے

تم جلتے رہو صحرا میں میرے ہمسفر و
 میں نے گرداب میں چھوڑا ہے سفینہ اپنا
 طاقتِ اِذن ہے کیا ، قوتِ مرضی کیا ہے
 حق کی مرضی پہ ہے جب مرنا و جینا اپنا

”ٹھکانہ“

ان بہاروں سے جی چرانا ہے
لالہ زاروں سے دور جانا ہے
جار ہے ہیں کہاں یہ مت پوچھو
ریگزاروں میں آشیانہ ہے
بات حق کی ہو جانا تو سنو
کوئی منزل ہے نہ ٹھکانا ہے!

”جراتِ موج“

شوریدہ سر امواج کے طوفانی تھپیڑے
جو غرق کیا کرتے ہیں ملاحوں کے بیڑے

وہ موج^T کہ منجدھار بھی موقوف ہے جس پر
وہ موج کہ جو موج ہے بنیادِ سمندر

وہ موج جو مستی میں کناروں کو تھکادے
وہ موج جو طوفان کے جذبوں کو بڑھادے

وہ موج کہ خاطر میں جو لائے نہ ہوا کو
وہ موج جو سمجھے نہ کبھی خوفِ خدا کو

گھائل ہی ہوا جن کے سبب سینہ ساحل
ٹکرانے چلا ہے انہیں موجوں سے مرا دل

”برنداون کا بخارہ“

آنکھ دہکتے انگارے ہیں ، دل خوشیوں کا گہوارہ
 سکھ کی کھوج میں گھوم رہا ہے بستی بستی بخارہ
 اپنی میلی پیٹھ پہ لادے اپنا اُجلا پن سارا
 جگنو جیسے اندھیارے میں بانٹ رہا ہے اُجیارا
 نوک جھونک کی کڑواہٹ سے پاک ہے اسکا بھولا پن
 میٹھی میٹھی اسکی بولی ، سیدھا سادھا بے چارہ
 مایا جال کے اس میلے سے اس کا کیا لینا دینا
 نیند کی چادر تان کے سوتا ہے دھرتی پر اک تارا
 محنت اس کا اپنا مذہب ، خون پسینہ دھن دولت
 شہر کا نٹ کھٹ ، کائیر ، لو بھی اس کو سمجھے ناکارہ
 چشمے جیسی اسکی اُمگلیں ، جھیل سی گہری اسکی لگن
 خالی ہاتھ کبھی لوٹا ہے بچ بھنور سے مچھوارا
 خوف کا سایہ اس کے سر پر ، پاؤں تلے بجلی بادل
 پیچھے پیچھے چاند ، ستارے ، آگے آگے سیارہ
 چلتے چلتے سانس جو پھولی ، بڑھ کے منزل پاؤں کو چھولی
 اُس کو ہوائیں کیا روکیں گی ، پر بت کو جو للکارا
 چیل کی مانند دیکھ رہا ہے ، کوؤں کی چھینا جھپٹی
 ہتھیارے کی نوچ رہا ہے بوٹی بوٹی ہتھیارا
 ساری دنیا کی سکھ شکتی بھر کر اپنی جھولی میں
 چین کی بنی باج رہا ہے برنداون کا بخارہ

”شاہی جمہوریت“

جب سے کھولی آنکھ ہم نے ملک ہندوستان میں
 اک نئی دنیا دکھائی دی نرالی شان میں
 دور شاہی تو نہیں لیکن وہی سامان ہیں
 کل جو تھے انسان تھے اور آج بھی انسان ہیں
 کل جو تھے سارے نظارے تک وہی
 چاند، سورج اور ستارے تک وہی
 پر یہ کیسا انقلاب

محل و مینار ٹوٹے، تیر بھی تلوار بھی
 اب کہاں وہ دل وہ دنیا مٹ گئے آثار بھی
 محل کے بدلے ہے بنگلہ
 تیر کے بدلے تفنگ
 تاج کے بدلے میں ٹوپی
 تحت کے بدلے میں کار
 شاہ بن بیٹھے ہیں سارے لکھ پتی، سرمایہ دار
 اس نرالے دور میں ہیں مفلس و نادار بھی
 جن کی محنت سے کھڑے ہیں محل بھی، مینار بھی
 کس کو ہے احساس آخر ان کی بھوک اور پیاس کا
 آج ہر کوئی ہے بندہ اپنی اپنی آس کا

اک طرف ہے فقر و فاقہ

اک طرف عیش و نشاط

اک طرف ننگے ہی ننگے

اک طرف ہر دم لباس

اک طرف ہیں قہقہے

اور اک طرف ہیں سسکیاں

اک طرف ہے روشنی

اور اک طرف تاریکیاں

مئے کے بدلے خون سے لبریز ہیں جام و سیو

کتنا سستا ہو گیا ہے آج آدم کا لہو

آج کتنا بھی ہو روشنی . کل کی رونق اور تھی

سچ اگر پوچھو تو کل کی بات ہی کچھ اور تھی

آصفِ سابع کی برسی پر نذرانہء عقیدت

حال کی تاریخ میں

ہم نے پڑھا تھا سنہرے دور کے اُس باب کو

آصفِ سابع، نظام الملک، سالارِ دکن

جو امیرِ انجمن تھا اور معمارِ چمن

ہر ورق پر اُس مثالی حکمران کا ذکر تھا

سادگی، بندہ نوازی، خیر خواہی، خوشدلی

علم و دانش، فلسفہ، شعر و سخن کا ذکر تھا

نقشِ صناعی عیاں ہیں آج بھی

اور تازہ ہیں سبھی آثار بھی

آسماں آزاد تھا ہر دُھند سے

اور منور تھا ہر اک ذرہ یہاں

چاند، سورج اور ستاروں کے سبب

پر یہ سب کچھ خواب ہے اپنے لئے

ہم نے جب سے آنکھ کھولی

اپنی نگاہیں آنکھ سے دیکھا ہے اک سورج گہن

نورِ آنکھوں کا بھی کچھ چکا

اور سبھی احساس اپنے مرچکے

اب یہ عالم ہے عزیزو

آنکھ کا غم ہے نہ منظر کا الم

” اے وطن ہندوستان “

عصر حاضر میں ہوا جب
 غلبہء جمہوریت
 اس صدی کا شاہکار
 سب کے دل کا ترجمان
 آرزوئے بیکراں
 ابتداء میں نور
 بڑھتے بڑھتے بن گیا شعلہ، شرر
 رفتہ رفتہ انقلاب منفرد
 آئینہ دکھلا گیا
 نوچ کر چہروں سے انکے ہر نقاب
 کھول دی دل کی کتاب

نیتیں قربانیوں کی
 دھونڈتی پھر نے لگیں قربانیاں
 بن گئے جلادر ہیر
 جو گیوں کا روپ دھارے
 اُف یہ قاتل سنگریزے
 قاتل جمہوریت
 قوم سے عہد وفا کو توڑ کر
 چار دیواری نئی تعمیر کی
 یہ سیاست دان، یہ سرمایہ دار
 بانی دہشت، دھرم کے ٹھیکدار
 اجتماعی کاوشوں سے
 دندناتی سازشوں سے

بس میں کر لی طاقت ارض و سماء
 پھاند کر دستور کی ہر اک فصیل
 پھونک کر قانون کی سب سر حدیں
 فرق کر لیں دولت امن و اماں
 رہن رکھ لی عزت ارض و وطن
 بچ کر کردار کا ترکہ سبھی
 لوٹ کر اجداد کا ورثہ سبھی

نت نئی جنت کے خواب
 نت نئے نعروں کا اک انبار ہے
 کاغذی ایثار ہے

اپنی اپنی کو ٹھیوں میں بیٹھ کر
 اپنا اپنا قوم سے منوالیا
 اب یہی سردار ہیں
 دریہ آزار ہیں
 ہر غریب و وسط طبقے کیلئے
 ہر شریف النفس فرقتے کیلئے
 بن گیا آتش فشاں
 زلزلوں کا اک جہاں
 اک اذیت کا نشان
 جل رہا ہے گلستاں

اے وطن ہندوستان ، ہندوستان ، ہندوستان.....

” اژدھا “

ہم سمجھتے تھے کہ
 ہم محفوظ ہیں
 حافظِ ہندوستان
 پاسبانِ آسمان
 سینہءِ کوہِ ہمالہ
 ہے محافظِ قوم کا
 رفعتوں پر جس کی دنیا سرنگوں
 تہند خود تیز رو گنگ و جمن
 روک دیں گی
 دشمنوں کے اس طرف بڑھتے قدم
 یہ یقین بے شک ہمارا سچ ہوا
 خارجی طوفاں کا خوف
 ہو گیا معدوم
 لیکن

سر اٹھائے اژدھا اک
 داخلی طوفان کا
 اپنے بس میں کر لیا سارا وطن
 اُسکے منہ میں قوم ہے اُتری ہوئی
 اُسکے ہر اک گھونٹ میں
 دبتی گئی ، کٹتی گئی
 گھٹتی گئی
 اور کچھ دم گر یہی عالم رہا
 وہ نکل جائیگا ساری قوم کو
 اژدھا وہ داخلی طوفان کا !.....!

”تو پھر اس عمارت کا حافظ خدا ہے“

یہ سچ ہے کہ اپنا وطن اک چمن ہے
مگر جس کیسا یہ کیسی گھٹن ہے

نہ پیڑوں پہ پھل ہیں، نہ پھولوں میں بو ہے
چمن کی ہر اک شاخ گل پر عدو ہے

وہ ندیوں میں کل کی روانی نہیں ہے
لہو ہے مگر ان میں پانی نہیں ہے

جو موسم سہانے تھے سب چل بے ہیں
جو لب پر ترانے تھے سب چل بے ہیں

جو معمار کا خواب تھا وہ کہاں ہے
وہ جذبہ جو بیتاب تھا وہ کہاں ہے

یہ کیسی عمارت بنانے چلے ہو
بنانے چلے ہو کہ ڈھانے چلے لو ہو

ستونوں میں باہم نہیں ربط کوئی
نہ دیواروں میں نظم اور ضبط کوئی

نہ چھت اپنا بوجھ آپ اٹھانے کے قابل
نہ بنیاد ہے اس عمارت کی حامل

بہت خو برو ہیں ترقی کے زینے
یہ اونچائی سے خود کشی کے قرینے

عجب نقش کاری ہے تہذیب نو کی
دراڑیں نمایاں ہیں تخریب نو کی

شکستہ ہیں در آبدیدہ در پچے
تمنائیں مردہ ہیں ملے کے نیچے

جو کھائی میں تھے وہ ہمالا نشیں ہیں
وہ کھدر میں ملبوس بالا نشیں ہیں

ہیں جتنی بھی شاخیں سبھی جھک چکی ہیں
جڑیں ، پیڑ کا سب لہو چوس لی ہیں

محافظ یہی سازشوں کی ہوا ہے
تو پھر اس عمارت کا حافظ خدا ہے

”وہ سحر لوٹ کر آگئی بھی تو کیا !“

وہ صبح

کہ جس کی تمنا میں ہم
آج تک رات کی
ظلمتوں میں ہیں گم
ظلمتیں بھی ہیں ایسی گھنی ظلمتیں
چاند ، سورج ، ستاروں کو جو کھا گئیں
آج تک ہے حکومت اسی رات کی.....!

روز اول سے اب تک..... یہی تو ہوا !
منج نور لیکر نکلتے ہوئے
کتنے ہی سورجوں کو ہڑپ کر گئی
جس کی باہوں میں لیکر کئی سسکیاں
ہچکیاں

روشنی کی کرن مر گئی
وہ سحر جس کی امید میں روز ہم
ہنس کے پیتے رہے
تلخیاں رات لی

اور پیتے رہیں گے قیامت تلک
وہ سحر لوٹ کر آگئی بھی تو کیا
اس سحر کی بھی اک شام ہوگی ضرور
شام ہوگی تو پھر رات ہوگی ضرور
رات ہوگی تو پھر بات ہوگی وہی
وہ سحر لوٹ کر آگئی بھی تو کیا.....!

”زبانِ یار مَن تُرکی و مَن تُرکی نمی دانم“

غریبی ، مفلسی کیا ہے ، بتاؤ بے کسی کیا ہے
یہ فاقہ مستیاں کیوں ہیں ، یہ طرزِ خود کشی کیا ہے
زباں کیوں بند ہے آخر تمھاری بے بسی کیا ہے

اگر پوچھو تو ہر مفلس حمیت سے یہ کہتا ہے
”زبانِ یار مَن تُرکی و مَن تُرکی نمی دانم“

کہیں پر دولت و ثروت کی بارش بے تحاشا ہے
ہمیشہ عیش و عشرت کا وہاں پر بول بالا ہے
اگر پوچھو تو نگر سے یہ نعمت کیسے پایا ہے

تو ظالم سر جھکا کر بس خجالت سے یہ کہتا ہے
”زبانِ یار مَن تُرکی و مَن تُرکی نمی دانم“

بہ شکل مشک بو رشوت ہوا میں ہو گئی مدغم
یہاں ملہار گاتا ہے ، کوئی ٹھہری ، کوئی سرگم
یہ خوشبو سونگھتے ہیں شوق سے کیوں حضرت آدم

زمانہ ساز آدم آدمیت سے یہ کہتا ہے
”زبانِ یار مَن تُرکی و مَن تُرکی نمی دانم“

یہ تم میں بے حسی کیوں ہے، یہ طرز بے رُخی کیا ہے
نظر میں یہ کہو آخر مقامِ آدمی کیا ہے
کوئی پوچھے جو رہبر سے رعایا پروری کیا ہے

چڑھا کر تیوریاں اپنی متانت سے یہ کہتا ہے
”زبانِ یار مَن تُرکی و مَن تُرکی نمی دانم“

یہاں قانون کا پرچم ہوا میں لہلہاتا ہے
یہاں ناکردہ جرموں کی سزا انسان پاتا ہے
یہاں مجرم کھلے بازار میں کیوں سر اٹھاتا ہے

تو مُصنّف فیصلے میں خود عدالت سے یہ کہتا ہے
”زبانِ یار مَن تُرکی و مَن تُرکی نمی دانم“

بھروسہ شیخ کا نہ برہمن کا کچھ ٹھکانہ ہے
حِبادت ، پاٹھ ، پوجا ہی تو انکا آبِ ودانہ ہے
فقط کم ظرفِ انساں ہی یہ دونوں کا نشانہ ہے

یہ سب کیوں ہے تو ہنس کر استقامت سے یہ کہتا ہے
”زبانِ یار مَن تُرکی و مَن تُرکی نمی دانم“

شہادت بابری مسجد کی پہلی سالگرہ پر۔۔ ۶ / دسمبر ۱۹۹۳ء (بمقام جدہ)

دو شعر

جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی کو باحق چھیڑ کر
مشتعل موجوں کو شر انگیز کہتی ہے ہوا
اس کی فطرت میں نہیں ٹھیراؤ یا سنجیدگی
ہر گھڑی جذبات کے دھارے میں بہتی ہے ہوا

(اس سانچے پر خود مادر ہند کے تاثرات)

انقلابِ وقت کی ہیئت پہ حیرانی میں ہوں
عکس ہے خشکی پہ میرا اور میں پانی میں ہوں
سر اٹھاؤں کیا لینے ماتھے پہ ٹپکا خون کا
سرنگوں ہوں جیسے سولی کی پشیمانی میں ہوں
وقت کے دھارے میں بہتے دور سے دیکھو مجھے
اب قریب آتا نہیں میرے کہ طغیانی میں ہوں
پھر مجھے اقبال سا گلزار میں دیدے خدا
دیدہ ور کوئی نہیں اندھوں کی نگرانی میں ہوں
جوش نے حالات کے بچنے ادھیڑے ہیں عزت
بہوش آسکتا نہیں جس میں وہ ہیجانی میں ہوں

”پانچ ب“

بیت المقدس ، بوسنیا ، بغداد ، بابری مسجد ، بمبئی ، مورخہ ۲۰/ اگست ۱۹۹۳ (جدہ)

”بربریت کا سفر“

بڑا چالاک تھا قاتل کا چہرہ کس نے دیکھا ہے
زمانہ نیند میں تھا یہ تہلکہ کس نے دیکھا ہے

بتائیں کا یہ کس نے صُور پھونکا کس نے دیکھا ہے
وہ بِل بھر میں کھڑی فصلوں کا جلنا کس نے دیکھا ہے

وہ شر انگیز فتنوں کا اُڈنا کس نے دیکھا ہے
اُنہا کی زمیں پر بھی ہے ہنسا کس نے دیکھا ہے

گلی کوچوں میں تھا اک زلزلہ سا کس نے دیکھا ہے
سروں پر آگرا تھا سر کا سایہ کس نے دیکھا ہے

دلوں میں کھولنا آتش فشاں کا کس نے دیکھا ہے
وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں کا لاوا کس نے دیکھا ہے

اندھیرے بانٹتا ہے کیوں اُجالا کس نے دیکھا ہے
چراغوں کے دلوں میں بھی ہے دعویٰ کس نے دیکھا ہے

کیا لُحوں نے کیوں صدیوں کا سودا کس نے دیکھا ہے
کہ اس رت پر ہے کیوں اُس رت کا قرضہ کس نے دیکھا ہے

گواہوں پر جو طاری تھا وہ سکتہ کس نے دیکھا ہے
 ہوئی جنبش تو ڈر کے بس یہ کہنا کس نے دیکھا ہے

زمانہ سرخیاں اخبار کی پڑھتا رہا لیکن
 لہو میں تر بہ تر لاشے پہ لاشہ کس نے دیکھا ہے

غذا ہے اب فقط اُنکے لئے بندوق کی گولی
 کہ اُنکے سامنے روٹی کا ٹکڑا کس نے دیکھا ہے

یہ آدم کا لہو اک بار جو پی لے تو کیا چھوٹے
 وہ آسمان پر تھا برسوں کا پیاسا کس نے دیکھا ہے

منظم سازشیں ہیں کارفرما اس طرف ہر دم
 ادھر ہے منتشر میرا قبیلہ کس نے دیکھا ہے

ہمارا احتجاج و بدماغی سب نے دیکھی ہے
 تشدد کا جو اس میں ہے سلیقہ کس نے دیکھا ہے

غذا ہے اب فقط ان کے لئے بندوق کی گولی
 کہ ان کے سامنے روٹی کا ٹکڑا کس نے دیکھا ہے

گدھوں کی طرح منڈلاتے ہوئے دشمن کے طیارے
وہ دشمن پھر بھی تھا سہا ہوا سا کس نے دیکھا ہے

مدارس ، گھر ، دواخانے ، مساجد اور تہہ خانے
ہوئی یلغار جن پر بے تحاشا کس نے دیکھا ہے

سخت کا ڈھنڈورہ پیٹتے پھرتا ہے وہ لیکن
ہمارے آہنی ہاتھوں میں کاسہ کس نے دیکھا ہے

زمانے کی نظر ہے بابرؑ مسجد کے بلبے پر
کرداروں دل جو ٹوٹے اُن کا ملبہ کس نے دیکھا ہے

اُسی دل پر ہوئے ہیں روزِ اول سے ستم لاکھوں
وہ دل کہتے ہیں جس کو گھرِ خدا کا کس نے دیکھا ہے

مقیّد اُسکو کر بیٹھے منادر میں مساجد میں
جو بحر بیکراں ہے بے کنار کس نے دیکھا ہے

پیہر تھا محبت کا وہ جس کو رام کہتے ہیں
تشدد کو مٹایا تھا کہنیا کس نے دیکھا ہے

کیا ہے رام کی دھرتی پہ بچے سے رقص راون نے
ہے اسکا سچے بھگتوں کو جو صدمہ کس نے دیکھا ہے

بدن کو کاٹ کر ٹکڑے تو کر سکتی ہے یہ لیکن
کسی تلوار سے پانی کا کٹنا کس نے دیکھا ہے

یہ پانی ہو گیا تقسیم سارے باغبانوں میں
چمن ہے کس لئے اُجڑا ہوا سا کس نے دیکھا ہے

یہ ہو گا نقشہ دنیا کو لیکر کل نئی نسلیں
یہ پوچھیں گی کہاں اپنا وطن تھا، کس نے دیکھا ہے

سنجھل جاؤ عزیزانِ وطن اب بھی سنجھل جاؤ
یہ جھگڑا آج جی ہے اپنے گھر کا کس نے دیکھا ہے

”عصر حاضر“

زائد وقت گناہ گار ہے اللہ کی پناہ
اب مسیحا مرا بیمار ہے اللہ کی پناہ
قوم خود برسرِ پیکار ہے اللہ کی پناہ
کوئی رہ بر ہے نہ سالار ہے اللہ کی پناہ

کوئی مغرور ہے مختار ہے اللہ کی پناہ
کوئی مجبور ہے الاچار ہے اللہ کی پناہ
ہر کوئی زر کا طلبگار ہے اللہ کی پناہ
ہر طرف مصر کا بازار ہے اللہ کی پناہ

لالہ و گل نہ رہے اب وہ گلستاں نہ رہے
سامعین وجد میں آئیں وہ غزلخواں نہ رہے
حسن کے تاز گئے عشق کے پیماں نہ رہے
درد تھا جن کے دلوں میں وہی انساں نہ رہے

کس سے پوچھوں کہ مرے درد کا درماں کیا ہے
سوئے منزل تو چلا ہوں مرا ساماں کیا ہے
پوچھتا ہوں دلِ مایوس سے ارماں کیا ہے
دل بھی چھلنی ہے مرا چاک گریباں کیا ہے

زخمِ ساحل بھی عبث ، زورِ تلام بھی عبث
نالہ فرسائی بھی عبث ، رنگِ تبسم بھی عبث
ہے عبث وجہِ خموشی و تکلم بھی عبث
سچ تو یہ ہیکہ یہاں میں بھی عبث ، تم بھی عبث

”اخبار“

ہر صبح

اخبار والا

پھینک کر جاتا ہے میرے سامنے
 حادثے ، کچھ سانحے ، کچھ مرحلے ، کچھ مسئلے
 میرے پڑھنے کیلئے
 ساری دنیا کی نئی تازہ
 سیاسی سازشیں
 اپنی اپنی سرحدوں کے واسطے
 نت نئی کاوش
 نئی جدت
 نیا جبر و قہر
 دنیوی توقیر کو
 یا ستاروں کی نئی تقدیر کو ، تسخیر کو
 خود کشی ، چوری ، ڈکیتی
 جائیدادوں کی یہ جنگ
 یا علاقائی قہر
 اک قیامت خیز منظر
 چند صفحات میں سمایا کس طرح
 روز پڑھتا ہوں یہ خبریں
 سوچتا ہوں روز کہ
 یہ بقا کے واسطے ہیں یا فنا کے واسطے

”ظلم کی آندھیاں“

ظلم کی آندھیاں
رفتہ رفتہ بڑھیں
گر گئے گھر، شجر
بستیاں پھونک کر

بڑھتے بڑھتے یہاں سے وہاں ، ہر طرف
ساری دنیا کے اعصاب پر چھا گئیں
ساری قوموں کی تہذیب کو ڈھا گئیں
ظلم کی آندھیاں

قوم کس قوم کی بات کرتے ہو تم
درس ، کس درس کی بات کرتے ہو تم
سی چکے لب کو سب معتبر آدمی
دور تک اب نہیں راہ بر آدمی
راہ بر ہو تو اس کا دھی کون ہے
ہمنوا کون ہے ؟

سر کٹانے کا جذبہ فوت ہو گیا
گھر لٹانے کی ہمت کسی میں نہیں
ہے اگر سر فروشی کی تحریک تو
ایسی تنظیم کے سر پھرے لوگ ہیں
وہ تو مجنون ہیں !

ظلم سہتے ہوئے اب تو مظلوم بھی
ظالموں کی اطاعت میں مشغول ہیں
ظلم کی آندھیوں سے ہے سہی ہوئی
ساری خلقت یہاں
کون ہے یہ کہو اس بلا کا جواب
ایک حق کے سوا

حق کی آواز بھی کون سنتا ہے اب
کس کو معلوم قہر الہی ہے کیا
آسمانی صحیفوں کا حافظ خدا
ان صحیفوں کا کیا تذکرہ دوستو
حق کی آواز بھی طاق پر رہ گئی !.....!

”زنجیر دار“

نالہ فریاد اب تو

ہے صدائے بے صدا

کون پرسانِ بشر ہے

ایک حق کے ماسوا

کھٹکھٹایا در عدالت کا کوئی

مردِ جلیل

قہر ہی بڑھ کر کسے گا

اس کی مشتیں

کھینچ لائے گا اُسے یوں زیرِ دار

جیسے فریادی نے کھینچی تھی منتِ

”زنجیر دار“

بر طرف ، حدِ نظر تک

محلِ شاہی ، قصرِ سلطانی ہیں استادہ مگر

وارثوں میں اب کہاں

وہ عدل گستر

حق پسند و حق نگر

اب کہاں نوشیرواں واسکا در

جس کے در پر

کل تھی آویزاں کوئی

”زنجیر دار“

وہ جہانگیری عدالت بھی نہیں

کہ جس کے در پر تھی کبھی

”زنجیر عدل“

اب مکانوں پر کہاں ”زنجیر در“

سب کے سب ہیں خود غرض و کم نظر

اب کوئی اکبر ، علی عادل

بکرماجیت سامنصف کہاں

جن کے در پر جا کے دستک دیجئے

کیجئے آہ و بکا

”سردار“

حامل اُلجھن و افکار نظر آتا ہوں
جھوٹی تکرار سے بیزار نظر آتا ہوں

خوابِ غفلت کے مزے اب ہیں میسر کس کو
عالم نیند میں بیدار نظر آتا ہوں

خوفِ طوفاں ہے نہ ساحل کی تمنا مجھ کو
آپ خود باعثِ منجدھار نظر آتا ہوں

میرے سائے سے بھی ڈرتا ہے زمانہ لوگو!
جیسے گرتی ہوئی دیوار نظر آتا ہوں

امن کے دور میں مینارِ محبت میں ہوں
عالمِ جنگ میں تلوار نظر آتا ہوں

آپ حاکم ہیں نظر آتے ہیں ایوانوں میں
میں ہوں سردار سردار نظر آتا ہوں

”بجٹ“

پرتوں کو رائی ہر قطرے کو قلمزم کر دیا
اس نئے میزان نے ہم سب کو گم سم کر دیا
قوم کے ہر زخم کو دیکھا تھا جو روتے ہوئے
قتل کا اعلان وہ زیر تبسم کر دیا

”حوصلہ“

سو رہو چپ چاپ ہر اک غم سے پنپا جائیگا
رات کٹ جانے بھی دو کل صبح دیکھا جائیگا
ناپتے ہو طولِ آہِ سرد کو نالوں سے کیوں
وقت کو تیغِ تدبیر سے ہی ٹالا جائیگا

”دلاسه“

آنکھوں میں دھرا کیا ہے جو تم جھانک رہے ہو
کیوں اپنی گیسوؤں سے مجھے ڈھانک رہے ہو
دیتے ہو دلاسه تو کچھ ایسا ہی لگے ہے
ٹوٹا ہوا کرتے کا ہٹن ٹانک رہے ہو

”مسیحائی“

ذرا تو سوچ اے دانا کہ دانائی سے کیا ہوگا
مقابل جب ترے پر بت ہے تو رائی سے کیا ہوگا
مشیت کو نہ ہو منظور جب تیری مسیحائی
مسیحا، پھر بتا تو ہی، مسیحائی سے کیا ہوگا

”مشورہ“

آج سچائی کی کچھ قیمت نہیں
 آدمیت کی کوئی وقعت نہیں
 چاک دامانی کو سینے کیلئے
 مال وزر لازم ہیں جینے کیلئے
 قوم دیکھو کام کتنے کر گئی
 آدمیت مر گئی تو مر گئی
 کس قدر پچھڑے ہوئے ہو تم میاں
 دور کتنی دور جا پہنچا جہاں
 مفلسی پہ اپنی تم اینٹھے ہو کیوں
 بھوک لگتی ہے تو چپ بیٹھے ہو کیوں
 تم بھی خنجر سے لہو چاٹا کرو
 خوب چلتا ہے یہی دھندہ کرو
 بیچ دو اجداد کی تہذیب کو
 ہے یہی موقع اٹھو تخریب کو
 قوم کے حق میں بنو جب ناگ تم
 پہلے ہنسا کی لگاؤ آگ تم
 قتل اور غارتگری جب کر چلو
 پھر انسا کی سادھی پر چلو
 ہاتھ میں کچھ پھول ملائیں لینے
 خون کے جلنے لگیں گے پھر دیئے
 جب یہ چولا پہن کر آجاؤ گے
 قوم کے تم رہ نما کہلاؤ گے

محاسبہ

محتسب کیا ، حساب کیا شے ہے
 کون حاسب ہے یاں
 محاسب کون
 یعنی محسوب کا خدا حافظ
 نیتوں کا فتور جاری ہے
 جرم و مجرم ، منقش و تفتیش
 بحث ہو یا مباحثہ ، کچھ ہو
 ہر ثبوت ، ہر گواہ جھوٹا ہے
 عدل و انصاف ہی نے لوٹا ہے
 فیصلے اب ہیں حقیقت سے پرے
 کیا کرے کوئی اور کیا نہ کرے
 مسئلہ بن گئی ہے ہر فریاد
 مرحلے سارے ہو گئے مشکوک
 نیتوں کا فتور جاری ہے
 ہر ترازو پہ باٹ بھاری ہے
 محتسب کیا ، حساب کیا شے ہے

”خشت و سنگ“

خشت کی ہے حیثیت
 خشخاش سی
 منحصر ہے اس پہ لیکن
 ہر عمارت کا وجود
 خشت سے جب خشت ملتی ہے
 تو بنتا ہے مکاں
 ٹوٹتی ہے خشت تو
 دیوار سے دیوار کی بنتی نہیں
 پھر دراڑیں پھیلتی ہیں ہر طرف
 سب مکینوں کو جگانے کیلئے
 زخم پر مرہم لگانے کیلئے

سنگ اک بنیاد ہے
 ہر عمارت اس پہ ہے ٹھہری ہوئی
 یہ زرا اپنی جگہ سے گرہٹا
 اس کے سر پر ہی گرے گا
 یہ مکاں

خشت و سنگ
 ہیں یہی اسبابِ تشکیلِ مکاں
 جب تلک مربوط ہیں
 وجہ تسکینِ مکان
 گر تصادم ہو گیا
 تو خشت کا ہر احتجاج
 سنگ کی اک چوٹ کا محتاج ہے
 ہے یہی تو
 خشت و سنگ کی داستان.....

”اعتماد“

اعتمادِ اک وصف ہے ایقان کا
ایمان کا ، انسان کا

جیسے سورج وقت کا پابند ہے
صبح صادق سے ظہورِ شام تک
مطلعِ ہستی سے پھر انجام تک
فرض کی تکمیل کا بینِ ثبوت
ہے اسی تمثیل کا اک اور نام
اعتماد.....

”دوستی“

رَبطِ باہم ، ضَبطِ پیہم
شرطِ اُلْفَتِ دائمی
از دمِ تائیس سے
تا دمِ آخر تلک
ایک جذبِ استقامت کا ہے نام
دوستی.....

” معاہدہ “

یہ دنیا خواب سی ہے
زندگی اک نیند کا عالم
ہزاروں نعمتیں بکھری پڑی ہیں
جھوٹی تعبیروں کی مانند
آزمائش کیلئے
عارضی ہے زندگانی
مستقل امید ہے
زندگی محسوس کرتی ہے ضرورت
ہر ضرورت مانگتی ہے
ایک قیمت ، اک ضمانت ، اک عہد
ہر ضرورت ڈھونڈتی ہے راستے
زندگی ممکن نہیں ہوتی
شرکت کے بغیر
غیر ممکن ہیں فرائض
عہد و پیاں کے بغیر
عہد و پیاں منحصر ہیں
نیوؤں کی ساکھ پر
اک طرف ہے
حرص و لالچ اور خیانت
اک طرف
دل میں امانت اور دیانت جاگزیں
اک ندی کے دو کنارے
رو برو ہیں
پر کبھی ملتے نہیں.....

”انحراف“

یکجہتی ، ایک مرکز
 ہر زمانے کا تقاضہ تھا
 ابھی تک ہے
 رہے گا تادم دنیا مگر
 آج تو یہ خواب ادھورا ہے عزیز
 اور اس کا اک سبب ہے
 انحراف.....

اک عجوبہ ہے یہ دنیا
 ان گنت مخلوق سے پر
 اک عجائب گھر ہے یا
 ایک سرکس ہے کہ زو
 آدمی بستے ہیں یوں تو ساری دنیا میں مگر
 اختلاف شکل و صورت
 عادت و خصلت
 پئے رنگ و نسل ہے آشکار
 کوئی صورت ہو کسی صورت سے ملتی ہی نہیں
 کوئی فطرت ہو کسی فطرت سے ملتی ہی نہیں
 ہر طبیعت مختلف ہے
 مختلف فکر و نظر

مسئلہ گر ایک ہی ہو
 حل مگر کب ایک ہے
 امتحاں گر ایک ہی ہو
 کب نتیجہ ایک ہے
 گفتگو ہو ، مشورہ ہو
 فرد کا یا انجمن کا مسئلہ ہو
 اختلافی ، احتجاجی جنگ ہے

”اتحاد“

نہیں ہیں متحد الفاظ جس کے
 سمجھتا کون ہے مفہوم اس کا
 ازل سے اتحاد اک خواب سا ہے
 ابد تک خواب کا عالم رہیگا
 صد اس سانچے کا غم رہے گا

اسی کے واسطے مذہب بنے ہیں
 اسی کے واسطے قانون بھی ہے
 مخالف ہیں مذاہب کے عقائد
 منافق ہو گئے منصف کے منصف
 کہاں مذہب کی پابندی ہوئی ہے
 کہاں قانون کے آثار ہیں اب
 کہاں مذہب کے تابع دار ہیں اب
 مسیحا سب کے سب بیمار ہیں اب.....!

”ساکھ“

شخصیت کی اساس ہے نیکی
 آدمیت کا اعتبار مدار
 زندگی ہے تو اعتماد سے ہے
 کارگاہِ حیات کی کنجی
 جذبہ درِ امانت ہے عزیز
 طاقتِ دین و دیانت ہے عزیز
 عزت و شہرت و سطوت کیا ہے
 یہ وجاہت یہ رمزِ حسن سلوک
 ایک پہچان اک علامت ہے
 شخص کی یا کسی شرافت کی
 آنکھ باقی ہے تو بینائی سے
 سلب ہو جائے جو بینائی تو
 یہ سمجھ لو کہ اس کی آنکھ گئی
 اٹھ گیا اعتبار تو سمجھو
 دل گیا ، درد گیا
 ساکھ گئی

” تسلط “

بظاہر دور سے دیکھا تو دریا
 بڑے صبر و سکون سے بہہ رہا تھا
 مگر نزدیک سے دیکھا تو پایا
 تلاطم خیز موجوں کا کرشمہ

یہی اک جستجو ہر موج کی تھی
 کہ دریا پر تسلط ہو اسی کا
 مگر اس خوش گمانی کی بدولت
 نبیر و زبر کا ماجرا تھا
 اسی عالم میں دریا بہہ رہا تھا.....!

”یہ دنیا“

ناکام تمناؤں کو سینے میں دباؤ
لہہ اُمیدوں کے چراغوں کو بجھاؤ

کچھ اور بڑھانی ہوں اگر منظمیتیں اپنی
ناکردہ گناہوں کا بھی الزام اٹھاؤ

آئیں نہ تمہیں رازِ بد گلشن کی ہوائیں
اس دشت کے ذرات کو پلکوں پہ سجالو

ہم کو نہ توقع ہے نہ اُمید نہ حسرت
یہ دنیا تمہاری ہے اسے تم ہی سنبھالو

”لمحہ فکر“

لمحہ لمحہ ہے یار صدیوں کا
ایک لمحے پہ بار صدیوں کا
لمحہ فکر ہے یہی لمحہ
جس پہ ہے انحصار صدیوں کا

”گڈنڈی“

یہ کل کی ہے بات یہ دنیا
بہت بڑی کہلاتی تھی

چھوٹا سا اک گاؤں بڑا تھا

اس کنیا سے اُس کنیا تک

جو گڈنڈی جاتی تھی

اپنی باہوں میں رکھتی تھی

ہرے بھرے کھیتوں کے خوشے

کھلی کھلی ہریالی بھی

بہتے جھرنوں کا پانی تھا

سوندھی مٹی کی خوشبو

چرواہوں کے بنسی کی دھن

موہ لیا کرتی تھی من کو

اونچے اونچے پیڑوں سے چھن کر آتی تھی

ٹھنڈی ٹھنڈی دھوپ کی کرنیں

جن پر ساون کے جھولے

ملہا رنیا کرتے تھے

الھڑ، کنواری، پریم کی ماری

سکھیاں مکلی تھام کے

پگھٹ سے پانی بھراتی تھیں

دور کہیں پر بت کے ٹیلوں پر

آکاش اترتا تھا

مدھر ہوا کے جھونکے آکر

دل کو لہلہا کرتے تھے

اس گڈنڈی پر کیا جانے

کتنی صدیاں بیت گئے.....

بڑھتے بڑھتے شہر کے سائے

روند کے کھیتوں کی ہریالی

جھرنے، پگھٹ، پیڑوں پر بت

کنیا سے کنیا کا رستہ

بہینچ لیا ہے اپنے بس میں

قدرت کے رنگین نظارے

فطرت کی نقاشی کو

جس گڈنڈی پر جیون تھا

توڑ کے اُسکو باندھ رہا ہے

مصنوعی سڑکوں کا جالا

اونچی عمارت کی زنجیریں

رینگتی پھرتی ہیں دھرتی پر

ناگن جیسی موٹر گاڑی

کچھ صنایعی کے مرکز بھی آن کھڑے ہیں

ان سب کے سینے سے دھواں اُٹھتا ہے شر کا

تیز ہوا سے باتیں کرتے اُڑن کھٹولے

ساگر کے سینے پر دیکھی

ہم نے چلتی پھرتی دُنیا

پورپ کو چھو تا ہے ہاتھ

اُتر سے دکھشن کا بندھن

بت جھڑ کے موسم کی مانند

ٹوٹ پڑا ہے اس دنیا پر

مصنوعی بارش کا پانی

جس کی رو میں بہتی دیکھی

ہم نے اپنی گڈنڈی.....؟

”تشویش و اندیشہ“

مقام آزمائش ہے یہ دنیا
مراحل اور مسائل کا ہے مسکن
زمین و آسمان و ماہ و انجم
جبال و دشت و صحرا، بحر و بر کیا
سبھی تھرا گئے اس امتحاں سے

غم ہستی، گراں بارِ امانت
مگر انسان نے ہنس کر اٹھلیا
متاعِ غم کی دھڑکن اپنے دل پر
جسے انجام کی پروا نہیں ہے
اسے تشویش و اندیشہ ہے کیوں کر
اُصولِ زندگی جب تک نہیں ہے
متاعِ زندگی بے فیض ہوگی
اگر تقدیر کا قائل ہے انساں
اگر تدبیر پر مائل ہے انساں
تو پھر تشویش و اندیشہ ہے بے جا.....

”پرکار ہستی“

تعیین^۱ ہی حقیقت کی کڑی ہے
حقیقت ہے

مکاں سے لامکاں تک
ستاروں اور سیاروں کے آگے
یہ دنیا ایک نقطے سے بھی کم ہے
اسی نقطے پہ لیکن منحصر ہے
وقوف سوزن پرکار ہستی
یہیں سے دائرے کھینچنے گئے ہیں
یہیں سے فاصلے ناپے گئے ہیں
حدود عالم تحت الثری کے
مقام کرسی عرشِ علی کے
شعاعِ شمس اور نورِ قمر سے
یہیں پر روشنی ڈالی گئی ہے
یہیں ظلمات نے ٹھیکہ لیا ہے
یہیں سے روشنی بانٹی گئی ہے
تعیین ہی حقیقت کی کڑی ہے.....

”نقش بر آب“

دل ہے اک جھیل کی مانند مگر
 اُس کی خاموش دھڑکنوں کی زباں
 آسمانوں سے بات کرتی ہے
 ہر ستارے کو توڑنے کی ہوس
 جھیل پر سنگ بن کے گرتی ہے
 آرزوں کو چھیڑ جاتی ہے
 آنکھ عقاب سی جھپٹتی ہے
 خوانِ نعمت کے ظاہری پن پر
 جستجو ایک امڈ تا طوفاں
 موج اٹھتی ہے اُمٹتیں لیکر
 بحر ہستی کی موتیوں کیلئے
 ہو کے مایوس جب پلٹتی ہے
 بس یہ کہتی ہے تند موجوں سے
 نقش بر آب ہے دنیا کیا ہے.....

”شرابِ ہستی“

نہ چکھے جو شرابِ غم کہاں ہستی میں آتا ہے
جو پیتا ہے مئے اُلفت وہی مستی میں آتا ہے
فرشتوں کا ٹھکانہ لاکھ پاکیزہ سہی لیکن
مزرہ انسان کو انسان کی بستی میں آتا ہے

”تنقیدِ جس“

یہ دنیا ہے یہاں چپ سادھ کے رہنا بھی مشکل ہے
ستم اس سے سوا یہ ہیکہ کچھ کہنا بھی مشکل ہے
ہوا کی سرکشی پر سوچ کے تنقید کیجئے گا
یہ ساکت ہوگئی تو جس کا سہنا بھی مشکل ہے

”رحلت“

گھر کا سکون دفن کئے گھر کی گود میں
سونے چلے ہیں پھر اُسی مادر کی گود میں
پانی تو کب کا بن کے بخارات اُڑ گیا
اب ریت ہی پڑی ہے سمندر کی گود میں
”پرسہ“

بعد مرنے کے بھی ظالم جی جلانے آئے ہیں
میرے اپنے تھے کبھی، یہ حق جتانے آئے ہیں
جن کی نظروں میں کھٹکتا تھا میں کانٹے کی طرح
آج وہ بھی پھول مرقد پر چڑھانے آئے ہیں

”مزار“

قید ہستی

چاروں کی بات ہے یا

چار ہمدیوں کا سفر

بے خبر آغاز سے انجام سے

ایک دل

جس کے سینے پر منوں کا بوجھ ہے

اس کے اوپر نفس ہے بیٹھا ہوا

خواہشوں و آرزوں کا جہاں

اک دھڑکتی داستاں

ایک ذہن

مخزن علم و ہنر

طائر فکر و نظر

ذہن و دل

اپنی قدرت کا عصا تھامے ہوئے

ہوش کے پروان چڑھتے ہی

سفر جاری کیا

باندھ کر رخت سفر

ہر قدم تدبیر کا

جستجو منزل کی لو

آرزو اک مرحلہ

ساتھ ہے تقدیر بھی

پاؤں کی زنجیر بھی

کھو گئے کس دھند میں

آج پھر یہ ذہن و دل

پر بت و دریا ، سمندر ، ریگزار

چلتا پھرتا اک مزار

تھک گیا اس بوجھ سے

تو لحد میں پائی اماں

پھر منوں مٹی کا بوجھ

ایک مٹی کا مزار !

”برزخ“

یہ کیسی نیند آئی ہے شبِ تر
 نہ تکیہ ہے نہ بستر ہے نہ چادر
 ملا کر خاک میں تازک بدن کو
 رکھا احباب نے اُس پر گلِ تر
 ہے کتنی مختلف شامِ غریباں
 نہ شمع ہے نہ کوئی شمع پرور
 فقط ناسوت کی مٹی ہی مٹی
 پڑی ہے عالمِ برزخ کے اندر
 نہ رشتہ ہے نہ رابطہ نہ بندھن
 نہ بندہ ہے نہ آقا ہے یہاں پر
 فقط اعمالِ نامہ ساتھ میں ہے
 کوئی مسرور ہے اور کوئی مضطر
 یہ رنگ و نور کی دنیا ہے جھوٹی
 ہے بے رنگی کا عالم سب سے بہتر
 مصوّر ہے نہ ہے تصویر کوئی
 قلم باقی رہا نہ لوح و منظر
 نہ جانے کتنی مدت کیلئے ہیں
 یہ سختی نام کی یہ خاک و پتھر
 فقط اللہ ہی اللہ ہے عزیز اب
 مقامِ ہو ہے یہ اللہ اکبر

”انتشارِ ذات“

ذات اپنی
 ایسا لگتا ہے
 بکھر کر ہو گئی ہے منتشر
 تنکا تنکا چن رہی ہے اب
 سمٹنے کیلئے
 پر ہوا ہے کار فرما
 وقت کے شانہ بہ شانہ
 ذرے ذرے کو بکھرنے کیلئے
 کب تک جاری رہے گا
 کیا خبر یہ سلسلہ
 انتشارِ ذات کا.....!

”گھر“

آدمی جو اشرف المخلوق ہے
یو نہی بے معنی ملاکب یہ خطاب
جی رہا ہے بلبلایہ
تند موجوں پر
ہواؤں کے مقابل
بازوئے گرداب میں
ایک چنگاری سی ہے
اس آب میں

ہر کنارے سے کنارے تک
اسی کاراج ہے
آپ خود ظالم بھی ہے
جاہل بھی ہے، نادان بھی
بلبلایہ خود، موج خود
گرداب خود

ایک قطرہ، اپنی قسمت
اپنی کوشش سے جو بنتا ہے گھر
آپ اپنی ذات میں ہے یہ سمندر
گو بظاہر ایک قطرہ ہی سہی.....!

” چراغِ زندگی “

یوں بھی یہ دنیا بڑی عیار ہے
 آدمِ خاکی کی فطرت ہے عیاں
 اس عمارت کا یہی معمار ہے
 آدمِ خاکی کی قدرت ہے عیاں
 سنتِ ہابیل اور قابیل سے
 آدمِ خاکی کی نیت ہے عیاں
 منظم بھی ہے یہی تنظیم کا
 اک نمونہ ہے یہی تعظیم کا
 اس جہاں میں ہے اسی سے انتشار
 ہے اسی کے دم سے ہی یہ لالہ زار
 خوف سے اسکے جہاں سہا ہوا
 آدمی سے آدمی بہکا ہوا
 ہے اسی سے ہر توقع ہر اُمید
 راہزن بھی خود ہے اور خود ہی رشید
 اپنے رب کا ماننے والا ہے یہ
 علم حق کا جاننے والا ہے یہ
 یہ جہاں کیا ہے سراغِ زندگی
 آدمی کیا ہے چراغِ زندگی

”ذہن“

جسم و جاں کا ہے مُر کتب
 آدمی
 جسم کی پاکیزگی
 ایمان ہے
 ذہن کو دیتی ہے یہ
 اک تازگی
 ذہن سے تعمیر ہستی
 ذہن سے طرزِ حیات
 ذہن سے ہیں سب صفات
 ذہن کے دشمن نگاہ و دل، جگر
 نفس کے پیغام بر
 خواہشوں کی اس دہکتی آگ میں
 ہے ہوا جذبات کی
 آفات کی، صدمات کی
 جو ہنسائے ایک بار
 پھر رُلانے زار زار
 روح کی پاکیزگی کے واسطے
 ہے ضروری دولتِ علم و عمل
 لازمی ہے ایک دستورِ حیات
 ذہن پر ہے جسم و جاں کا انحصار
 ذہن کی پرواز پر دار و مدار.....

”خواب اور تعبیر“

جسے سب خواب کہتے ہیں
وہ بیداری کا عالم ہے
جسے کہتے ہیں بیداری
وہی تو خواب ہے یارو
یقیناً خواب جب ہوگا
کوئی تعبیر بھی ہوگی

اگر شفاف ہو شیشہ
نظر آتی ہے ہر صورت
مگر ہو گرد شیشے پر
دکھائی کچھ نہیں دیتا
یہ سب شیشے پہ ہے موقوف

سنواک خواب وہ بھی ہے
نظر آتا ہے جودن میں
حواس و ہوش میں نین
کسی بھی خواب کا ”سچا عمل“ تعبیر ہوتا ہے
وہی تحریب ہوتا ہے
وہی تعمیر ہوتا ہے.....

”تقدیر و تدبیر“

پوچھتے کیا ہو کہ ہے تقدیر کیا
تدبیر کیا

بیعت ہستی جو ہے تقدیر ہے

زائچہ ہے زیست کا

ایک خاکہ ہے کسی تصویر کا

اور ہر تصویر تخلیق موصور ہی تو ہے

درس کی خاطر مدرّس کی یہی تحریر ہے

اور یہ تدبیر کیا ہے

بس اُسی تحریر پر مشقِ قلم

لکھتے لکھتے روز اس تحریر کو

سنّتے سنّتے روز ہر تقریر کو

عود کر آتی ہے اس میں خود ہی

لکھنے اور پڑھنے کی اُمنگ

رفتہ رفتہ خود ہی لکھتا ہے وہ پڑھتا ہے یہ خود

پنی اپنی داستاں

اپنے ہی الفاظ میں

اُسکا لہجہ فن ہے ہر اظہار کا ، اقرار کا

انکار کا

پھر یہ طالب اپنی ہستی کے سبھی اہل کا

علم حاصل کر کے بنتا ہے مدرّس

بس یہی اک سلسلہ ہی

راز ہے تقدیر و تدبیر کا.....

”وہم و یقین“

اک یقینِ عشق بھی ہے
 مظہر مہر و وفا
 مشہدِ صدق و صفا
 جو کسی تصدیق کا حامی نہیں
 تحفہء توفیق ہے
 عطیہء عربِ جلیل
 فضل رب کا اک ثبوت
 ایک لمحہ اُس جنوں کا
 زیرِ کردیتا ہے ہر احساس کو
 پھر شعورِ دل یہ کہتا ہے
 بصدِ عجز و نیاز
 ہاں میں شاہد ہوں
 اُسی مشہود کا
 جو بعید از فہم ہے
 نزدیک جاں!

وہم ہے اک من گھڑت
 ہیئت کا نام
 اک شکستہ ذہن کی برکشلی
 اک خیالی زائچہ
 و ہوسہ ساکت کئے جاتا ہے
 پتلی آنکھ کی
 ذہن پھر اپنے خیالی وصف سے
 شکل دیتا ہے نئے اضام کو
 دل کو دیتا ہے تسلی عارضی

اور یقین ہے ایک عطیہ علم کا
 پھر یقینِ علم اکساتا ہے شے کی دید کو
 جذبہ تصدیق یا تردید کو
 پھر وہی منظر گذر کر آنکھ سے
 دل کو دیتا ہے یقینِ محکم
 ثبت کرتے ہیں پھر اپنی مہر جس پہ
 چشم و دل ، ذہن و ضمیر

”قیامت“

بنائے کائنات و نظم ہستی
دلیل حکمت و قدرت خدا کی
ازل سے تا ابد نقش معظم
مکان تشکیل پایا لامکان سے
پس تعمیر ہے انجام و مقصد
نتیجہ آخرت ہے اس کڑی کا

دلیل اولیں یہ خوبصورت
زمین و آسمان
شمس و قمر ہیں
وجود انجم و سیار گاہی
مکان زیست کی بنیاد ٹھہرے
ازل سے ایں زماں، روزِ ابد تک
منظم ہیں، رہیں گے چاند تارے

دلیل ثانوی تخلیق آدم
کمل پیکر عشق و محبت
اساس حاصل دنیا و دیں ہے
اسی کی ذات سے منسوب ہیں یہ
جمع مخلوق و موجودات ہستی
اسی کے واسطے پیدا کئے ہیں
خدائے پاک نے جن و ملائک
اسی کے دم قدم سے زندگی ہے
اسی کے ولولوں سے بزم دنیا

”مقیاس“

موسموں کے ناز اٹھاتے
 بوجھ سینے پر اٹھائے
 حادثوں کو اپنی پٹکوں پر سجائے
 گرم ریتیلی زمیں پر
 یا کبھی قالین سی ہریالیوں میں
 یہ نشیبی یا فرازی
 رہ گذر
 آزماتی ہے اُسے ہر اک گھڑی
 اُسکو اکساتی ہے پھر سیئات پر
 کھینچ لاتی ہے رہ حسنت سے
 وہ گھڑی ہر مردِ مومن کیلئے
 صُورِ اسرافیل سے کچھ کم نہیں
 اور وہی مقیاس ہے.....

جس طرح روزِ ازل سے
 وقت کا جن گامزن ہے
 سوئے منزل دم بہ دم
 ہے کسی مقیاس کی مانند
 جس کا ہر قدم
 فرق ہوتا ہی نہیں رفتار میں
 جذبہ ایثار میں
 اس کے ہر اقرار میں
 وقت دیتا ہے پیامِ زندگی
 اک اُصول و ضابطہ دستور کا
 اک نمونہ، اک مثال
 اک نظامِ زندگی

قلبِ انساں بھی تو اک مقیاس^۱ ہے
 اپنی فطرت، اپنی قدرت
 اپنی نیت کا امیں
 تولتا ہے ہر عمل کو یہ ضمیر
 گامزن ہے سوئے منزل
 پھونک کر ہر اک قدم
 دشت و صحرا میں چن میں

یہی وہ نور ہے نوری ہیں جن سے
 یہی وہ نار ہے ناری ہے جن سے
 لزوم نظم ہستی ہے اسی پر
 بلندی اور پستی ہے اسی سے
 اسی کے واسطے سب نعمتیں ہیں
 اسی کے واسطے سب منزلیں ہیں
 اسی کے واسطے ہر رہبری ہے
 اسی کے واسطے ہر گمراہی ہے
 یہی ایمان کامل کا نمونہ
 یہی مشکور خوان بے بہا ہے
 یہی ہے مجرم کفرانِ نعمت
 اسی پر ہے خدا کی ساری رحمت
 اسی پر ہے مدارِ ظلم و رحمت
 اسی خاک میں پنہاں ہے حقیقت
 اسی کے دوش پر بارِ امانت
 یہی تو حاملِ تقدیر بھی ہے
 یہی تو قادرِ تدبیر بھی ہے
 اسی کے سامنے ہیں خیر و شر بھی
 اسی کے سامنے راہِ عمل بھیج
 عمل ہی پر اساسِ زندگی —
 عمل ہی سے ظہورِ بندگی ہے
 قیامت ہے دلیلِ حرفِ آخر
 حسابِ زندگی کا آخری دن
 حیاتِ جاوداں کا روزِ اول
 وہی دن حاصلِ آغاز ہوگا
 وہی دن مظہرِ انجام ہوگا.....

ایک پیام۔۔۔ ملت کے نام

”زمیں سخت ہے آسماں دور ہے“

گیا وقت جب ہم تھے میر سفر
مگر آج کیوں ہیں اسیر سفر
تھی صدیوں تلک اپنی جادوگری
تھی دنیا میں مشہور زندہ دلی
دلوں میں حرارت تھی ایمان کی
نگاہوں میں تیزی تھی ایقان کی
مزاجم تو پریت بھی ، دریا بھی تھے
مگر ہم کبھی اک چھلاوہ بھی تھے
تھے یارانِ شمشیر و تیغ و سناں
بدکتے تھے ہم سے زمیں آسماں
جو دل میں تھا وہ کر گذرتے تھے ہم
شجاعت سے جیتے تھے مرتے تھے ہم
تھے ضیغم بھی سہے ہوئے کل تلک
تھی اپنے ہی نقشِ قدم کی جھلک
مگر آج نقشہ ہے بدلا ہوا
یہ شفاف پانی جو گدلا ہوا
دلوں سے وہ ملت کا غم مٹ گیا
محمدؐ کی اُمت کا غم مٹ گیا
ہمیں میں ہیں کچھ اپنے ہی کف شکن
صفیں خاک باندھیں گے یہ صف شکن

خود اپنی صفوں سے یہ غافل ہوئے
 یزیدوں کے لشکر میں شامل ہوئے
 جو بڑھ کر صفیں چیرتے تھے کبھی
 خود اپنوں سے کرتے ہیں رسہ کشی
 خدا ایک ، رسول ایک ، قرآن ایک
 مگر اب کہاں سب مسلمان ایک
 گروہوں میں بٹ کر جدا ہو گئے
 جماعتوں میں کٹ کر ہوا ہو گئے
 مساجد میں پڑھتے ہیں یوں تو نماز
 مگر کیا پتہ ، کیا ہیں راز و نیاز
 وہ رہبر ، وہ راہی ، وہ رستہ نہیں
 خلوص و وفا دست بستہ نہیں
 اعانت سے اکمل سیاست ہوئی
 امانت سے افضل خیانت ہوئی
 محبت سے برتر رقابت ہوئی
 حقارت سے کم تر لیاقت ہوئی
 خدا ہم کو توفیق ایمان دے
 دلوں میں مجاہد کا ایقان دے
 بدل دو روش گھر کے افراد کی
 دکھاؤ انہیں راہ اجداد کی
 یہ موسم سدا گنگناتا نہیں
 ” گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں “
 نشان اپنی منزل کا کافور ہے
 ” زمیں سخت ہے آسمان دور ہے “

”فریاد“

اے خدا کیا چیز لایا تھا وہاں سے کچھ نہیں
اور لے جاؤں گا میں کیا کچھ یہاں سے کچھ نہیں؟

آب و آتش ، باد اور مٹی کی پیداوار ہوں
اور مرا رشتہ زمین و آسمان سے کچھ نہیں؟

اپنے سارے غم چھپاتا ہوں خزانے کی طرح
اور ملے گا کیا مجھے درد نہاں سے کچھ نہیں؟

تجھ کو اے مالک غرض ہے اک نتیجے سے میرے
اور مرا مطلب میرے ہی امتحان سے کچھ نہیں؟

تو نے کس کے رکھ دیا تقدیر کے اک جال میں
پھر بھی میں نے کچھ کہا اپنی زباں سے کچھ نہیں؟

دور آدم سے ابھی تک آدمی بے چین ہے
کیا ہوا اس آئین امن و اماں سے کچھ نہیں؟

قتل و خوں کے نت نئے فتنے اُجاگر ہو گئے
کیا ہوا مظلوم کی آہ و نغماں سے کچھ نہیں؟

روئی کی مانند ہے انسانیت دھنکی ہوئی
 ریزہ ریزہ آئینہ ہے ، کانچ ہے بکھری ہوئی
 اک اذیت بن چکی ہے ، آدمی کی زندگی
 ہر توقع اٹھ چکی ہے آس ہے ٹوٹی ہوئی

خیر سے بھاری ہوا جاتا ہے شر کا زور کیوں
 یہ زمیں تیری ہے اس پہ صنعتوں کا شور کیوں
 آدمیت کا خزانہ لوٹتا ہے آدمی
 اب ضمیر انسان کا ہی بن گیا ہے چور کیوں

دور آیا پھر، وہی فرعون کا ، نمرود کا
 پھر وہی نقشہ نظر آتا ہے ہست و بود کا
 آدمی کو خوف سا ہے آدمی کے نام سے
 اس جہاں میں پھر سے سکتہ جم گیا مردود کا

امت خیر الوری کو شر سے تو محفوظ رکھ
 سنت نور الہدیٰ کی روشنی ہو ہر طرف
 گونج اٹھے پھر سے صوت حق فضاء میں چار سو
 مدحت حق کی ہی لب پر چاشنی ہو ہر طرف
 (آمین)

”شکوہ“

کارزارِ زیست ہے

چاند، سورج

رات اور دن

رنج و راحت کے سبب

ہے رضامندی قلندر کی صفت

اور شکوہ فطرتِ آدم ہے بس.....



لکیریں بول اٹھتی ہیں جو چپ رہتی ہیں تصویریں
حقیقت جاگ اٹھتی ہے جو جگ اٹھتی ہیں زنجیریں
بھارت سے فلک نہ کہہ ہمیں تو خاک کا پتلا
بگڑ جاتا ہے جب انسان سہم جاتی ہیں تقدیریں

اے تلاطم اب ٹھہر جا ہوش میں آنے بھی دے
مانتے ہیں اے سنگرم یہ سہم جانے بھی دے
تجھ سے ہم ٹکرا چکے ، تنگ آچکے ، باز آچکے
اب سفینے کو مرے ساحل سے ٹکرانے بھی دے

ہم راہ بن کے دشتِ وفا میں ٹھہر گئے
تم ایک راہرو تھے نہ جانے کدھر گئے
اپنی حدوں سے ہم کو گذرنا نہ آسکا
ہم پر سے حادثات ہزاروں گذر گئے

خوبصورت زندگی کی داستاں سُنتے رہے
زندگی بھر زندگی کے خواب ہی بچتے رہے
اپنا دامن عمر بھر کانٹوں میں ہی الجھا رہا
اُنکا دامن بھر گیا جو پھول ہی چُختے رہی

داغِ کچھ غم سے لگے ، کچھ شادمانی سے لگے
 کیا دِلِ آزرده خاطرِ زندگانی سے لگے
 اشک ہی وجہِ الم ہے ، اشک ہی وجہِ خوشی
 آگِ پانی سے بجھے ہے آگِ پانی سے لگے

لغزشِ یہ کیسی آدمِ نادان کر گیا
 شیطانِ زندہ رہ گیا ، انسانِ مر گیا
 شیشے کو توڑنے کی تو سازش تھی اور کی
 الزام جب گیا تو وہ پتھر کے سر گیا

اپنی شکستِ فاش سے یہ فائدہ ہوا
 ایسا لگا ہے مجھ کو کہ میں مر کے جی اٹھا
 ہوتی ہے رات ہی سے تو تشکیلِ صُبحِ نو
 نورِ شفق سے دُوبتے سورج نے یہ کہا

یہ تحائف لیے آئی ہے ہماری زندگی
 کڑوی سچائی کا غم ، جھوٹی تسلی کی خوشی
 چپ رہیں تو خود فراموشی ، کہیں تو خود سری
 دیدنی ہے دیدنی ہے آدمی کی بے بسی

یہ بھی سچ ہے کہ شب تھی سویرا نہ تھا
 پھر بھی گھر کا اندھیرا اندھیرا نہ تھا
 گھر جو چھوٹا تو خیمے میں آیا خیال
 اپنا گھر بار تھا کوئی ڈیرہ نہ تھا

خوشی گم ہو گئی اپنی تو سارے غم بھی کھوجائیں
 اب ایسی نیند آئے خواب کے عالم بھی کھوجائیں
 تمناؤں کا سورج ڈھل چکا ، منزل کی دُھن ٹوٹی
 چلو اس رات کی تاریکیوں میں ہم بھی کھوجائیں

ہوئے ہیں عشق میں ہم کس قدر حیران مت پوچھو
 زیاں و سود کا ہم سے کوئی میزان مت پوچھو
 یہ کیا کم ہے مقامِ دار تک پہنچادیئے ہم کو
 کرم اتنا کرو اب آخری ارمان مت پوچھو

مٹی ہے عمر ساری کام کے دو پل نہیں ملتے
 مٹے تو ہمیں ملتے ہیں اُنکے حل نہیں ملتے
 گلا پودوں کا واجب اور ہمارا بھی گلا واجب
 انہیں پانی نہیں ملتا ہے ہم کو پھل نہیں ملتے

نظامِ دنیا جو منتشر ہے نہ جانے کس دن بحال ہوگا
جواب کیا دیں، ہر ایک لبّ پر اگر یہی اک سوال ہوگا
جہاں چمکنا بھی ناروا ہو، جہاں سکنا بھی اک خطا ہو
اُس انجمن کی روایتوں سے نباہ کرنا محال ہوگا

رہبر ہمارے حکم چلانے میں رہ گئے
دستور سارے میز کے خانے میں رہ گئے
معمار کو تعمیر کا اعزاز مل گیا
مزدور اپنا بوجھ اٹھانے میں رہ گئے

خوف و دہشت کی دُزیروں نے منادی پھیر دی
زندگی کے اُجلے چہرے پر سیاہی پھیر دی
ریت پر کیا کیا نہ لکھا تھا اُمّتوں سے عزیز
آج اُس تحریر پر ہم نے ہتھیلی پھیر دی

پتھر صفت ہیں لوگ کوئی موّم سا نہیں
اس پر ستم یہ ہے کہ تجبّ ذرا نہیں
یہ بھی ہے ایک حکمتِ حاضر کا کرشمہ
گرتا ہے آئینہ بھی مگر نوبتا نہیں

جس طرح دل ہے ضروری دلشیں کے واسطے
 اک مکاں بھی لازمی ہے ہر کمیں کے واسطے
 عمر ساری دیکے میں اک گھر بنایا تھا مگر
 اقرباء حیراں ہیں پھر دو گز زمیں کے واسطے

آدم سے نسلِ آدم اک دم سے سینکڑوں دم
 صد رنگ ، صد نسب میں کس طرح بٹ گئے ہیں
 لگتا ہے یہ زمیں خود محور سے ہٹ گئی ہے
 یا ہم ہی آپ اپنے منظر سے ہٹ گئے ہیں

آدمی عیب و ہنر ہیں مستند تیرے لیے
 سارے دستاویز تیرے ، ہر سند تیرے لیے
 ہیں قصیدے ہی قصیدے ہو اگر تو نیک خو
 ورنہ یہ حرفِ ملامت ، لفظِ بد تیرے لیے

تلفی چھپی تھی زیرِ تبسم ، نہیں جانے
 کس کی طرف تھا روئے سخن تم نہیں جانے
 تم شعر سن رہے تھے بڑے انہماک سے
 لیکن مرا اندازِ تکلم نہیں جانے

اک مرحلہ ہے تلخ تکلم سے نمٹنا
مشکل ہے بہت میرے لیے تم سے نمٹنا
قسمت سے ملی ہے ہمیں کاغذ کی یہ کشتی
اور اُس پہ ضروری ہے تلاطم سے نمٹنا

خو بدل دیتی ہے یارو آپ ہی مجبوریاں
موم کو پتھر بنا دیتی ہے رو جذبات کی
میکشی ہوتی نہیں ہے لا ابالی کا سبب
ناصحا ! یہ دین ہے بس تلخی حالات کی

زندگی بھر عشق کے اسباق میں مارے گئے
چپ کے بیٹھے طاق میں تو طاق میں مارے گئے
وہ تو دانا تھے سیاسی موت نے مارا جنہیں
ہم وہ دیوانے ہیں جو اخلاق میں مارے گئے

سہارا بے کسوں کو مال و زر والا نہیں دیتا
یہ کیسا پیڑ ہے جو دھوپ میں سایہ نہیں دیتا
غلط ہے یہ تمہارا پوچھتے پھرنا زمانے سے
پتہ اپنا کسی کو کوئی بجا رہ نہیں دیتا

بن پئے ہی سر جو چڑھ جاتی ہے اُس مستی میں ہوں
جس میں صہبیا ہی نہیں ہے بس وہ پیانہ ہوں میں
میں خرد مندوں کی کج فہمی پہ خیرانی میں ہوں
اور دنیا یہ سمجھتی ہے کہ دیوانہ ہوں میں

تم نے رکھ دی سامنے اپنی کتابِ زندگی
کیا کہوں کہ اک حقیقت ہے یہ ساری داستان
جو پڑھے گا وہ یہی کہتا ہوا رہ جائیگا
پڑھ رہا ہوں آپ بیتی یا تمھاری داستان

عمر کافی ہے ادب کی تجربہ ہے مختصر
اے قد آور آشنا سن قد مرا ہے مختصر
دل کے آگے حسرتوں کی ہے بڑی لمبی قطار
وقت لیکن زندگی کا رہ گیا ہے مختصر

چھتے ہیں ہر نظر میں سر پھر بھی غم نہیں ہے
کانٹوں کا بانگین بھی پھولوں سے کم نہیں ہے
شیشہ صفت ہیں لیکن پتھر بنے ہوئے ہیں
یوں جی رہے ہیں جیسے احساسِ غم نہیں ہے

خبر جو اک نئے طوفان کی آئی تو یاد آیا
سُفینہ تو ہے طوفاں میں کنارِ جب سے چھوڑا ہے
نہ رکھتا ہے تعلق نہ مجھ سے بے تعلق ہے
کسی نے ساتھ بھی چھوڑا ہے تو کس دُھب سے چھوڑا ہے

کس قدر لمبا سفر ہے زندگی کا یہ سفر
شام سر پر آگئی ہے پھر بھی گھر آتا نہیں
انتظارِ یار میں لو ہند تو جاتی رہی
رات کیوں جاتی نہیں ہے وہ اگر آتا نہیں؟

1029

2-99

سایہ گل میں کبھی گھر جو بنانا چاہا
سی رہا ہوں اُسی خوش بخت کی صد چاک قبا
دل کو رہتا ہے اسی بات کا افسوس عزیز
بجلیوں نے بھی وہیں اپنا ٹھکانا چاہا
جو پرچے مرے دامن کے اڑانا چاہا
تم نہیں چاہ سکے جس کو زمانہ چاہا

آئینہ دیکھ کے جلوؤں کو نہ حیراں کرنا
گل کو پامالی حالات کے تابع کر کے
شمع جلتے ہی یہ پروانہ بھی جل اٹھتا ہے
ظلمتِ شب کا ستاروں سے تعلق ہے مگر
میری ذلت ہے تو خود تیری بھی رسوائی ہے
میری فطرت میں ہے پیوند لگاتے جانا
کیسی فطرت ہے یہ خاکی میں ودیعت یارب
تا مناسب ہے یوں اندھوں کو پریشاں کرنا!
باغبانی پہ یوں آندھی کو نگہباں کرنا!
کیا ضروری تھا شبِ ستاں میں چراغاں کرنا؟
نصیح دمِ رات کے سایوں کو نہ عریاں کرنا
تو پشیمان ہے تو مجھ کو بھی پشیمان کرنا
تیری عادت ہے اگر چاک گریباں کرنا
دشت کو باغ تو گلشن کو بیاباں کرنا

آپ خود اپنی روش پر بھی نظر رکھ اے عزیز
غیر موزوں ہے یوں سائے کو ہراساں کرنا

